

شانہ چوہدری

جنگل کی شہر

”فہم ایک تو ان محترمہ کو بہت جلدی ہوتی ہے
آئے کی۔“ رائے نے دھوپ کی نظر نہ آنے والی
ٹھوس شخصیت سے گویا مکالمہ شروع کیا۔
”جب سے ہم اس فلیٹ میں آئے ہیں عجیب و
غریب اتفاقات دیکھنے کو ملے ہیں۔ یہاں کی چیزیاں
جلدی اٹھ جاتی ہیں، خورشید میاں کو طلوع ہونے کی
جلدی ہوتی ہے، گھر کا راشن جلدی ختم ہو جاتا ہے۔
بجلی اور پانی پر اس بلڈنگ سے رخصت ہونے کی عجلت
سوار ہوتی ہے۔ اوھر کی تو ہر شے جلدی میں ہے حتیٰ کہ
انسان بھی۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں اٹھ
کر چیل ڈھونڈنے لگی امی نے ذرہ برابر توجہ نہ دی۔
جانتی تھیں صبح جلدی اٹھنے پر اسے خفقان ہو جاتا ہے
۔ روز کا معمول تھا۔ آج کی بات تھوڑی تھی۔ اسکول
جاتے ہوئے بھی اسی بیزاری و ناگواری سے کام لیا کرتی
تھی اور اب جبکہ جاب کرتے ہوئے دھپتے ہوئے تھے
ابھی بھی ہنوز وہی انداز تھے۔ رائے یوں بھی نئی جگہ آ
کر خوش نہیں تھی۔

”مجھے فلیٹوں کی زندگی سے بڑا خوف آتا ہے امی!
اتنی تنگ و تاریک وحشت زدہ اور ڈراؤنی زندگی۔“ وہ
جھرجھری لے کر کہتی۔

”فکر نہیں کرو۔ جہاں ہم جا رہے ہیں وہ بلڈنگ
بہت خوب صورت اور جدید ہے۔ نئی نئی بنی ہے اور
اس میں بہت سی سہولتیں ہیں۔“ وہ اسے بہلا رہی تھی۔
”مگر ہم اپنا گھر چھوڑ کر فلیٹ میں کیوں جائیں۔“

”رہو بیٹی! اٹھ جاؤ۔ دفتر نہیں جانا کیا۔“ امی کی
بوڑھی نقاہت بھری آواز سحر دم خواب خرگوش کے
مزے لیتی رائے کو بری طرح جھنجھلا گئی تھی۔
”ممتی جلدی ابھی تو سوئی تھی۔“ وہ مندی مندی
آنکھوں کو بمشکل کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ امی
نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے ہٹا دیے تھے۔ سارا
سا چھوٹے سائز کا یہ کمرہ جو مشکل بیڈ، دو کرسیوں اور
ایک میز پر مشتمل تھا روشنی کی تیز شعاعوں سے بھرتا
چلا گیا۔
”باہر دیکھو ذرا، کتنی دھوپ نکل آئی ہے۔“

کاولٹ



اس کی انجمن بھری نظریں ای کو افسردہ کر دیتیں۔
 ”اب یہ ہمارا کمر نہیں رہا ہے بیٹی! ان کے منہ سے بے اختیار سرود آہ نکل جاتی۔ راسخہ کے ابو نے ایک با عزت سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے کسی دوست سے ایک خطیر رقم ادھاری تھی پھر دوبار شروع کرنے کا ارادہ تھا۔ انہوں نے اپنی ساری جمع پونجی اس میں جھونک دی تھی۔ مگر بد قسمتی سے کاروبار نہ چل سکا اور اپنے روپے کے ساتھ ساتھ دوست کی رقم بھی ڈوب گئی۔ واپس تو بہر حال لوٹانا تھی۔ چھ ماہ کا وعدہ تھا اور اب دس ماہ گزر چکے تھے۔ مستقل تقاضوں نے ابو کو متھڑک کر دیا تو بہت دھمکیوں پر آگئی۔ ابو نے قرض کے اس بھاری بوجھ سے نجات پانے کے لیے ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنا ہاتھ بٹایا والی کھینچ دیا۔ دوست کو رقم دینے کے بعد جو ٹھوڑے بہت پیسے تھے۔ اس سے بی بی بین تھری کے علاقے میں اپنے والوں کی پانک میں ایک سال ایڈوائس پے منٹ کے بعد قرض کرائے پر لے لیا۔ مگر ابو کو نئے کمر میں پانا اس نے آسکا۔ ایک ماہ بعد دنیا سے رخصت ہو گئی۔

اسی وہ ہے راسخہ کو الپ اے کے دو سال بعد اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ چلانے کے بجائے جاب کی تلاش پر غور کر رہا تھا۔

باب کی وفات کے پانچ ماہ بعد اسے کمرشل پروڈکشن بنانے اور سیلانی کرنے والی کمپنی میں بطور سیکریٹری جاب مل گئی۔ اسی کو مجبوری کے عالم میں اسے نوکری کی اجازت دینا پڑی تھی کہ ان کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ گھر بار چلانے کے لیے خود میدان عمل میں آسکتیں۔

”تم شام کو کتنے بجے تک آؤ گی؟“ امی نے تھی میں ترہنہ کرنا اس کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”پچھ کہہ نہیں سکتی امی۔“ اس نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھر کر ایک لمحے کو سوچا۔

”پتا نہیں آج میری ڈیوٹی کمرشل ایریا میں ہو گی یا ریزیڈنشل ایریا میں پھر ڈیوٹی بننا کہ ہم سب کو شام پانچ بجے لیاقت صاحب کے آفس میں جمع ہو کر

رپورٹ دینا ہوتی ہے۔ لیاقت صاحب ہمارے نیچے کے انچارج ہیں۔“

”مجبوری کا نام شکر ہے ورنہ سچ پوچھ تو مجھے تمہاری جاب کی نوعیت پسند نہیں آتی۔ ایک جگہ تک کر سکون سے بیٹھ کر کرنے والا کام ہو تو بات ہے۔ یہ صبح سے شام تک اور پھر کرچر میں بیچنا ایک لڑکی کے لیے قطعی مناسب نہیں لگتا۔“ امی کے چہرے پر پریشانی کے ساتھ ساتھ بے بسی کے تاثرات تھے۔

”چیرس جیسے تھوڑی ہیں۔ انہیں گھر کے افراد اور وفات کے متعلقین سے متعارف کرواتے ہیں۔ تاکہ وہ ہماری کمپنی کے معیار اور قیمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مستقل خریدار بننے پر آمادہ ہو سکیں۔“ اس نے ایک طرح سے ماں کو سمجھایا۔

”اور اس کام میں یہ فائدہ ہے کہ جتنے زیادہ خریدار ڈھونڈیں گے اسی حساب سے طے پانے والے سووے کا میں فیصد ہمیں ملے گا۔ گویا اپنی کارکردگی کی بنا پر جتنا چاہیں منافع کما سکتے ہیں۔“ یہ دنی الفاظ تھے جو کمپنی نے جاب کے سلسلے میں اخبار میں دیے جانے والے اشتہار میں استعمال کیے تھے اور جسے پڑھ پر راسخہ انٹرویو دیتے لگی تھی۔

”خدا جانے یہ سچ بھی ہے یا محض بھانسنہ دیا ہے۔“ امی کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

”اب کیا کیا جا سکتا ہے امی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”نہ سر پر باپ ہے نہ بھائی اور نہ کوئی عزیز رشتہ دار جو اس سچ بھوٹ کی تحقیق کر دے یا پھر برہہ کر ہمیں سہارا دے۔ جو کرنا ہے خود ہی کرنا ہے۔ ایک ایف اے پاس لڑکی کو ”معزز زانہ“ قسم کی جاب مل بھی کیسے سکتی ہے۔“

ایف اے کے بعد اس کا بی اے میں ایڈمیشن لینے کا ارادہ تھا مگر ان ہی دنوں اسے ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ تقریباً ایک ماہ تک بستر سے نہ اتر سکی تھی۔ بعد میں ٹھیک ہوئی تو داغوں کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ امی نے تشفی کرائی کہ اگلے سال لے لیتا۔ اگلے سال ابو کاروبار کے سلسلے میں پھنس گئے اور پھر گھر والوں پر ایسی افتادوں کی پڑھائی چھوڑ کھانے پینے کا بھی ہوش

نہ رہا تھا۔ اسی آخر اتھری میں اگلا سال بھی ضائع ہو گیا۔

”میں سوچ رہی ہوں۔ جاب میں ڈیپاسیٹ ہو جاؤں پھر ریٹائرمنٹ لی اے کروں گی۔ تعلیم بغیر ترقی نہیں۔“ اس نے سوچتی نظروں سے اڑی کو دیکھا۔

”ارے تو بجتے میں بیس منٹ رہ گئے ہیں اور مجھے دو گاڑیاں بدل کر دفتر پہنچنا ہے۔“ جو نی وال کلاک پر نظر پڑی وہ اسیرنگ کی طرح اچھلی تھی۔

”ہو سکے تو واپسی پر جلدی آجانا۔ جو تھے فلور والی ٹریا کے بیٹے کو چوٹ لگی ہے۔ اس کی عیادت کر آئیں گے۔“ وہ چادر اوڑھ کر سیاہ ہینڈ بیک لیتے ہوئے دروازے سے نکلی تو پیچھے سے امی نے ہانک لگائی تھی۔

”اچھا۔“ خدا جانے اس کی ”چھا“ امی تک پہنچی تھی یا نہیں۔ وہ تو دھڑا دھڑیڑھیاں طے کرنے میں مشغول تھی۔ یہ بلڈنگ چھ منزلہ تھی اور ان کا فلیٹ پانچویں منزل پر تھا۔

”وہ اکیلا تھا جو لفٹ لگوا دیتے۔“ ناگنیں لوٹ جاتی ہیں اس آنے جانے کی مشقت میں۔ ”وہ جی بی جی میں عمارت بنانے والوں کی شان میں قصیدہ گوئی کر رہی تھی۔ سیڑھیوں پر نیم تاریکی تھی۔ اسی دھن میں خبر نہ ہوئی کب پیچھے سے اوپر آنے والے فولادی جسم سے ٹکرائی۔

”اؤف۔“ ٹکر اس زور کی تھی کہ اس کی آنکھوں کے آگے تر مرے ناچ گئے۔ وہ بری طرح لڑکھرائی اس سے پہلے کہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی منہ کے بل نیچے گرتی۔ اس شخص نے اپنا توازن بحال رکھتے ہوئے اسے بازوؤں میں تھام کر قابل افسوس حد تک بھیا تک موت سے بچایا۔

”کیا آپ اپنے ہوش و حواس اوپر چھوڑ آئی تھیں۔“

گرفت کی طرح لہجہ بھی سخت اور پھر پلا تھا۔ یا اللہ انسان ہے یا سنگ و آہن سے بنا مجسمہ۔ وہ جھکاتے سر کو تھام کر بمشکل اپنے قدموں پر کھڑی ہوئی تھی۔ مردانہ آفٹر شیو لوشن، مسکریٹ کی خوشبو اس کے بہت قریب موجیں مار رہی تھی۔

”مخود بھی تو ریلوے کے انجن کی طرح چھکا چک اندھا دھند بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ آپ ہی آنکھیں کھلی رکھنے کی زحمت کر لیتے۔“ وہ خشک لہجے میں جواب دیا گویا ہوئی۔ اسے سمجھنے دیکھ کر موصوف نے فوراً ہی اپنے بازو ہٹا لیے تھے۔ اس کی جوابی جارحیت پر وہ شعلے کی طرح بھڑک گیا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں جان بوجھ کر آپ سے ٹکرایا تھا؟“

یا اللہ میں کہاں پھنس گئی۔ اس نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ کوئی بھی کسی بھی فلور سے اوپر یا نیچے آسکا تھا۔ آ رہا ہو گا یا آنے والا ہو گا۔ صورت حال اتنی ”حسین“ ہرگز نہیں تھی کہ وہ یہاں رک کر اپنا تماشہ بنواتی۔ خیریت اسی میں تھی کہ چپ چاپ اپنی راہ لیتی۔ سو وہ اچھنے کے بجائے ایک سائیڈ سے ہو کر جلدی جلدی بقیہ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے نیچے آگئی۔

کچھ دور چل کر اسے سونو کی مل گئی۔ پچھلی سیڑھیوں شخص نے ٹھنڈا کر بیٹھنے کے بعد وہ فکر مندی سے کھانسی کی کھڑی دیکھنے لگی۔ تو بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ سونو کی کو کراچی کمپنی اسٹاپ تک پہنچنے میں اتنا ہی وقت لگتا۔ وہاں سے مزابیس پر بیٹھ کر آؤ سٹرل ایریا پہنچنے میں مزید چند منٹ لگتے تھے۔

آج کے دن کی نحو تیس تو ابھی سے سامنے آگئی ہیں۔ اس نے جھلائے ہوئے انداز میں سوچا۔

اسی لمحے سونو کی کے پیچھے آنے والی ہونڈا سی ڈی سیوٹی پر نظر پڑی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ”کیا یہ شخص میرا چچا کر رہا ہے؟“ اس نے ڈھڑکتے دل سے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس کی رنگت گندمی تھی۔ اونچی کھڑی ٹاک اس کی خدی اور اٹل طبیعت کا ہادی تھی۔ چاکلیٹی لمبے دار گھٹے بال ہوا کی آنکھیلیں۔ سے ہلکے ہلکے اڑ رہے تھے۔ دیکھنے میں وہ ایک نومند اور مضبوط قد کاٹھ کا مرد دکھائی دیتا تھا۔

پریشانی فطری تھی۔ کیا سیڑھیوں پر ہونے والی اس سرسری سی جھڑپ کا اس نے اتنا اثر لیا ہے کہ بدلہ لینے کے لیے کئی کئی سال پیچھے چلا گیا؟ راسخہ کے

ماچھے پر اپنے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔
خدا خدا کر کے کراچی پہنی اسٹاپ آیا تو اس
تعاقب سے جان پھولی اتفاق سے اسے ایک منہ میں
سیٹ مل گئی جو جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔
سید اپ اسٹاپ پر بس مسافر اتارنے کے لیے رکی تو
اس نے پونہ گریڈن موٹر کریشے سے باہر دیکھا۔ اسے
یکدم جھٹکا۔

”اوہ“ وہی ہونڈا موٹر سائیکل کچھ دور آگے
ٹرینک سٹنل پر رکی ہوئی تھی۔ اس شخص کی اس کی
سمت پشت تھی مگر سفید لائنوں والا گرسے سوئٹر
ڈارک گرسے جینز اور جوڑے شانوں نے جیسے خود بخود
موٹر سائیکل سوار کی پہچان کرا دی تھی۔ آگے سوئی
گیس اسٹاپ پر اسے اترنا تھا اور اس کے اوسان ابھی
سے خطا ہونے جارہے تھے۔

سائیس براہر کرتے ہوئے اس نے بہت احتیاط و
آہستگی سے دھیرے دھیرے دائیں سے بائیں طرف
نگاہ کی۔ موٹر سائیکل آگے نکل گیا تھا۔

”شکر ہے خدا یا۔“ اس نے جھرجھری لے کر
بڑے آہنی گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اس
عمارت کے دو دروازے تھے ایک اگلا دوسرا عقی
دونوں کے آگے سڑک تھی۔ اس لیے آمد و رفت میں
بہت سہولت ہو جاتی تھی۔ اگلا حصہ کمپنی کے مرکزی
دفتر کی حیثیت رکھتا تھا۔ جہاں سامان کی ترسیل کے
لیے کاروباری لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ رات کے کام اسی
دفتر تک محدود تھا۔ پچھلے حصے میں فیکٹری تھی جہاں
سامان بنایا جاتا تھا۔ اس کا انتظامی انچارج اسفندیار
تھا۔

”اسلام علیکم“ آئی ایم سوری سر! میں کال لیت ہو
گئی۔“ اس نے ساٹھ کے نمٹے کے ہماری تن و توش
کے مالک لیاقت صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے
ہی جھکی معذرت طلب کر لی۔

”اسے سوچو کہ کر خفیف سا مسکرائے اور عینک اتار کر
میز پر رکھ لی۔

”یہ“ دیری“ یقیناً“ قابل تعریف ٹھہرتی اگر تم نے
واقعی اس سے غائب اٹھایا ہوتا۔“

”کیا مطلب سر!“ وہ حاضری رجسٹر پر سائن کرنے
کے لیے جھکی تھی۔

”مطلب تو صاف ظاہر ہے نہ چہرے پر ڈھنڈھ
زلف میں پھول نہ لباس میں رنگین نم نے تو کسی
ایک انداز میں بھی خاطر خواہ تبدیلی نہیں کی۔“ انہوں
نے افسوس سے سر ہلایا۔

”میرا خیال ہے سر! اس کی ضرورت نہیں ہے اور
نہ میری ہی اجازت دیں گی۔“ وہ سائن کر کے رجسٹر بند
کرنے کے بعد قلم میز پر ڈالتے ہوئے سنجیدہ ہو گئی۔

”دیکھو بھی“ جس طرح تیار کردہ مال کو قابل توجہ

بنانے کے لیے اس پر خوب صورت رہنمائی پہنچ
چڑھایا جاتا ہے اس کی دیدہ زیب پینٹنگ کی جاتی ہے
اسی طرح اسے فروخت کرنے کے لیے دکان اور دکان
دار کا پرکشش و جاذب نظر ہونا لازم سمجھا جاتا ہے۔
گاؤں خریدنے سے پہلے بیچنے والے کا جائزہ لیتے
ہیں۔“ لیاقت صاحب اس کی سنجیدگی بھانپ کر
خوشامد انداز اختیار کر چکے تھے۔

”یہ بات صرف تم سے ہی نہیں کہتا۔ فرحت بدلی
’تانیہ‘ آگے جو اوغیر کو دیکھ لو وہ بھی تمہارے شعبے
میں کام کرتے ہیں۔ کیسے سر سے پیر تک سجے بنے
ٹھہرے سحرے پھرتے ہیں۔ کمرشل ایریا کی طرف
نکلیں تو ہر کمپنی اور ایجنسی میں پذیرائی حاصل کرتے
ہیں۔ دفتر ہو یا دکان لوگ اس میں ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔

وہ کامیاب سوئے بازی کے بعد لوٹتے ہیں اور ریزی
ڈنشنل ایریا میں جائیں تو گھر کی خواتین ان کی مجھے دار
باتوں اور شائستہ و مہذب انداز سے متاثر ہو کر چرس
خریدتی ہیں۔ انہیں آرڈر دیتی ہیں۔ یہی اچھے اور
کامیاب سیلز ایگزیکٹو کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ میں چاہتا
ہوں تم بھی یہی ہنر اختیار کرو تاکہ کمپنی زیادہ سے
زیادہ گاؤں ملیں۔ کمپنی کو جتنے زیادہ سوئے لاکروڈ کی
اتنا ہی کمادگی اور ایک وقت آئے گا کہ تم اپنی
صلاحیتوں کی بنا پر بہت آگے نکل جاؤ گی۔ تمہارے
پاس اپنا بنگلہ ہو گا۔ اپنی کار ملازم اور بہت کچھ۔“

”بہت سلیقے طریقے سے اس کی آنکھوں میں
خواب سہانے کی کوشش کر رہے تھے اور شاید ان

خوابوں کی گرفت میں آ بھی جاتی اگر لیاقت صاحب
کے لب و لہجے اور انداز میں واقعی خلوص ہوتا۔ نہ
جانے کیوں اسے یوں لگا جیسے وہ انداز میں ڈال کر چڑھا چائے
کا اہتمام کر رہے ہیں۔

”مجھے بہت آگے نکل کر تیار جانے سے ڈر لگتا
ہے سر۔“

وہ سرو لہجے میں کہہ کر اجازت لیتی ہوئی باہر آ گئی۔
اپنی تو وہ معلوم کر ہی چکی تھی۔ اسے آج کمرشل ایریا
میں جانا تھا۔

باس کے کمرے کا چولی دروازہ کھلتے ہی خوشبوؤں کی

لہریں سی باہر نکلتی شام کے ساتھ آتی تھیں۔

”ہیلو رات۔“ رات نہ ہال کمرے میں کمپنی کا سامان

سے بھرا مخصوص بیک کنڈے پر لٹکا کر باہر نکلنے کو تھی

۔ جب باس کی طرح دار حسین و جمیل سیکرٹری شام نے

ہال کے ایک سائیڈ پر کاؤنٹر کے پیچھے رکھی ریو الونگ

چیرر بیٹھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”ہیلو مس شام! کیسی ہیں آپ؟“ وہ موتا۔

مسکراتی۔ شام عمر کے اعتبار سے پینتیس برس کی لازم

ہوئی بگڑ سیکھنے میں ہرگز بھی پچیس سے زائد کی نہیں

لگتی تھی۔ دلی بلی بے حد اسٹارٹ پر کشش فیکٹری کی

مالک اس عورت میں نچانے کیا تھا کہ باس نے پچھلے

دس برس سے اسے مستقل اپنی سیکرٹری بنا کر رکھا ہوا

تھا۔ بلکہ وہ ایک طرح سے کمپنی کی سیکنڈ باس تصور کی

جاتی تھی۔ باس اس کی بہت مانتے تھے۔ اسی وجہ سے

لوگ اس سے دبتے تھے۔

”ہم تو ٹھیک ہیں۔ تم سنو کیسی جارہی ہے جاب۔“

کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔“ شام کی ہنسی میں مروت کے

لیے اک خاص دلربائی اور ظلم تھا۔

”نہیں شکریہ۔“

”چھاسنو فرمان اینڈ سنز کے آفس کا چکر ضرور لگاتا“

باس نے خصوصی تاکید کی ہے۔ کچھ دن پہلے ان کی

بات ہوئی تھی فرمان صاحب سے۔ وہ ہماری کمپنی کی

پروڈکٹس میں دلچسپی رکھتے ہیں۔“ شام کی ہدایت پر

سرہلاتے ہوئے وہ باہر نکل آئی۔

”سلام بی بی۔“ کوریڈور میں جھانڈو لگاتی چالیس

پرس کی تند و تیز دھڑکنے والی آواز نے اسے دیکھ کر جھٹکا ایک طرف رکھ دی تھی تاکہ اس پر گرد نہ پڑے۔

”وہ عظیم اسلام خالہ کیا حال ہیں تمہارے۔“ رائے اس سے خاصی مانوس ہو گئی تھی۔ یہ کہانی کی بیرونی ملازمہ تھی رائے نے شروع شروع میں ایک دو مرتبہ اسے از خود سلام کیا تھا۔ بیوی کو سلام میں پہل کرنے کی تربیت امی نے گویا اس کی ہنسی میں ڈال دی تھی۔ ملازمہ اس کے حسن سلوک سے اتنی متاثر و مسحور ہوئی کہ اب دیکھتے ہی مودب ہو جاتی تھی۔ اکثر اس کی شہریار اور اہل گھر کی باتیں بھی کر لیتی تھی۔

”بی بی! اس جگہ سے آئیں؟“ اس نے اکثر محسوس کیا تھا کہ وہ اس کی یہاں نوکری پر خاصی متوجہ و متفکر رہتی تھی۔

”نوکری تو کرنا ہے ناں خالہ! جہاں قسمت لے جائے۔“ وہ چپکے پن سے مسکراتی تھی۔

”پر تمہارے جیسی لڑکیوں کے لیے یہ کام صحیح نہیں ہے بی بی! لڑکی ذات ہو۔ سارا سارا دن سڑکوں بازاروں اور گلی محلوں میں تنہا پھرنا اور طرح طرح کے مردوں کے پاس جانا ٹھیک نہیں لگتا۔ آج کے زمانے میں بیٹھنے اور شکرے جنگلوں کے بجائے آبادیوں میں نکل آئے ہیں شکار کے لیے۔“ ملازمہ اکثر موصحاکر کہہ دیتی تھی۔

”تم فکر نہیں کرو! خالہ میں ان سے بچنا جانتی ہوں۔“

♥ ♥ ♥ ♥

”بھئی آخر کب فارغ ہوں گے آپ کے فرمان صاحب۔“ ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد اس کا صبر جواب دے گیا تو وہ تیز میک اپ اور گھٹیا سے خیلے والی ریمپنٹ لڑکی سے الجھ پڑی تھی۔

”وہ منٹ سر چاہتے ہیں بالکل فارغ ہو کر آپ سے بات کریں۔“ وہ پچھلے چھوٹے کام پر جت گئی۔ رائے نے دل ہی دل میں فل اسپینڈ میں اسے گالیاں دیں۔ صبح سے کمرشل ایریا میں خوار ہو کر ویسے ہی اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ عجیب و غریب نظریں

کچھ کہنی ہوئی، تولیتی ہوئی، جسم میں کھب جانے والی ٹھنڈا دینے والی نظریں جن سے عجیب خوف سا محسوس ہوا تھا۔

کمرشل ایریا میں پہلی ڈیوٹی ہی بھیا تک تجربہ ثابت ہوئی تھی۔

”بس فرجان اینڈ منز آخری ٹارگٹ ہے“ اس کے بعد سیدھا آفس واپس جاؤں گی اور لیاقت صاحبہ کو صاف جواب دے دوں گی کہ میں آئندہ کمرشل ایریا میں ڈیوٹی نہیں کروں گی۔ اگر انہوں نے چوں چا کی تو مس ثناء سے بات کروں گی۔“

اس سے پہلے کہ اس کے خون کا ٹکٹہ کھولاؤ آخری پوائنٹ تک پہنچتا چھمک چھلوتے اندر جانے کا اشارہ کر دیا۔

اسپرنگ وار براؤن دروازہ اس کے اندر قدم رکھتے ہی آٹومٹک طریقے سے بند ہو گیا تھا۔ فلی فرنشمنڈ آرام دہ اور پر تعیش کمرہ اور پاس کی سینٹ پر بیٹھا درمیانی عمر کا پختہ و جامدیدہ لمبا چوڑا وجود۔ غالباً یہی فرمان صاحب تھے۔

”جی مس پلینز اشرف رکھیے۔“ اس کے لیے میں نرمی تھی۔ رائے الجھکتے ہوئے ٹیبل کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جانے کیوں اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا ایک پل رکنے بغیر یہاں سے نکل جائے۔

فرمان نے فون پر جانے کا آرڈر دیا تو وہ چوکی۔

”پلینز جناب! اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے روکنے سے انداز میں کہا۔

”تکلف نہ کیجیے آپ آرام سے بیٹھیے۔“ وہ بہت بھرپور نظروں سے اس کا صحیح و صحیح چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”میں آپ کو اپنی کمپنی کی پروڈکٹس دکھاتی ہوں۔“

”پراڈکٹس بھی دیکھے لیتے ہیں پہلے آپ کو تو خیر۔“ وہ اک ترمک میں کتا ہوا اچانک بات بدل گیا۔ رائے جز بزی ہو گئی اور بیک کھول کر کمپنی کی مصنوعات دکھانے لگی۔

”سر! ہماری کمپنی نے اعلا کو الٹی کی مختلف چیزیں

مارک کروائی ہیں مثلاً ”شیمپو“ ”سوپ“ ”ڈرجنٹ“ ”ادار گوش“ اور۔“

”ایک منٹ، ایک منٹ بار! سانس تو لے لو۔“ وہ بے انداز سے مسکراتا ہوا سیٹ چھوڑ کر اس کی طرف آیا تھا۔

”میرا خیال ہے جناب! آپ سنجیدہ نہیں ہیں۔“ میں چلتی ہوں۔“

وہ لمحے کے چڑاویں حصے میں اس کی آنکھوں میں اچھڑتی معنی خیز چمک سے اس کے ارادے کو پہچان گئی تھی سرعت سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے تم تو ناراض ہو گئیں۔ ابھی سو دا بھی ملے کے لیتے ہیں۔ بیٹھو تو سہی۔ اپنی کمپنی کی روایات پر قرار رکھتے ہوئے آرام و سکون سے دو گھڑی گھبر کر بات کرو۔“ وہ فوراً اس کی راہ میں مڑا مڑا ہوا۔

”وہ اور ہوتی ہوں گی جو آپ کے حسب منشا اور ”من پسند“ انداز میں سو دے کرتی ہوں گی۔ میں ذرا مختلف قسم کی لڑکی ہوں۔ آپ ان ہی سے ملے کر نیچے گا معاملات مجھے اجازت دیجیے۔“ اس سے پہلے کہ وہ اسے روکتا فون کی بیل بج اٹھی۔ ”اس نے قبضہ لائے ہوئے انداز میں فون اٹھایا رائے امداد بھی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لکھوں میں باہر نکل آئی۔

”میرے خدا!“ لفٹ کے بجائے وہ گرتی پڑتی سیڑھیاں ملے کر کے بلڈنگ سے نکل کر سڑک پر آئی تو اس کا پورا وجود پسینے میں غرق ہو چکا تھا۔

جو بھی لڑکی آئیے کام کے لیے نکلتی ہوگی اسے یہی مسائل درپیش آتے ہوں گے، کچھ حالات سے سمجھوتہ کرتی ہوں گی، فرحت رولی اور تانیہ کی طرح گاہک کی حسب خواہش اسے بھائی ہوں گی اور کچھ ایڈجسٹ نہ ہونے والی یہ فیلڈ چھوڑ دیتی ہوں گی۔ مگر میں ایسا کبہر کر سکتی ہوں۔ مجھے اس جاب کی ضرورت ہے۔“

”جی! عزت ضرور بچاؤ مگر تھوڑا سا اپنا رویہ نرم بھی رکھو۔“ اس سے فرحت نے کہا تھا۔

”سیلز گرلز کی بھی کچھ عزت ہوتی ہے۔ میں آپ

سے درخواست کرتی ہوں لیاقت صاحب سے کہہ کر میری ڈیوٹی گھر لو سچ تک محدود کر دیں۔ میں وفاتر اور کمپنیوں میں جا کر کام نہیں کر سکتی۔“

اس نے جاتے ہی جتنی انداز میں کہہ دیا۔ ”کیا گھر لو سچ پر ایسا نہیں ہوتا؟ یا وہاں مردوں کی بے ضرر“ اقسام پائی جاتی ہیں۔“ ثناء بے ساختہ مسکراتی تھی۔ ”میرا حال میں لیاقت صاحب سے بات کر لوں گی۔ بے فکر رہو۔“

”شکریہ مس ثناء۔“ اس نے سکھ کا سانس لیا۔ ”مگر ایک بات ضرور کہوں گی۔ مردوں کی دنیا میں رہنا ہے تو پھر انہی کا سالا کف اسٹائل اپنانا ہو گا۔ یہ بے جا قسم کی شرم و حیا، جھجک اور وقیانوسیت کے ساتھ تم ترقی نہیں کر سکتیں۔“

یا اللہ یہ ہر کسی کو میری ترقی و کامیابی کے لالے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ عاجز اگر سوچنے لگی۔

”مجھے دیکھو میں بسا اوقات کام کی غرض سے دو دو گھنٹے پاس کے کمرے میں بند رہتی ہوں۔ ہمارے درمیان طویل مذاکرات ہوتے ہیں۔ بہت سے معاملات زیر بحث آتے ہیں۔ مگر میں نے کبھی خود کو زور محسوس نہیں کیا۔ بولڈ ہو لڑکی اور نہ گزارا نہیں ہو گا۔“

”خیال رکھنے اور صحت کرنے کا دوبارہ شکریہ مس ثناء مگر میں ایک بات جانتی ہوں میں سن سب کی جانتی ہوں۔ مگر کرنی وہی ہوں جو بذات خود مناسب سمجھتی ہوں۔“

وہ مسکراتے ہوئے اسے آج کی کارکردگی دکھانے لگی۔

اسی دوران تانیہ اور اکمل کسی کام سے ثناء کے پاس آ گئے انہیں لیاقت صاحب نے بھیجا تھا۔

”مائی گڈ نیس! اس کے بارے میں تو پروڈکشن انچارج اسفند یار ہی مکمل تفصیلات فراہم کر سکتے ہیں۔ مسٹر اکمل! تم فیکٹری رابطہ کرو۔ میں بات کرتی ہوں۔“ ثناء کاغذات پر نظر ڈالتے ہوئے پریشانی سے گویا ہوئی۔

پھر وہ فون پر جت گئی۔ رائے نے نوٹ کیا تھا کہ

پروڈکشن انچارج سے بات کرتے ہوئے ثناء کا لہجہ خاصا نرم تھا۔ حالانکہ وہ اختیارات میں ہر حال ثناء سے بڑھ کر نہیں تھا مگر اس میں کچھ تھا کہ ورکرز مخاطب ہوتے ہوئے دھیان رکھتے تھے کہ وہ کہنی کا بڑا انہم پر نہ تھا۔

”مگر تم تھوڑی دیر کے لیے آجاؤ تو مجھے سہولت رہے گی۔“ ثناء کا انداز درخواست گزاری والا تھا۔ مگر حسب منشا جواب نہ پا کر وہ جھجھلائی گئی۔

”اپنا اسٹنٹ بیچنے کے بجائے خود زحمت کر لو تو نوازش ہوگی۔“

”چھا ٹھیک ہے۔“ اس نے مایوسی و نیم دلی سے فون رکھ دیا۔

”سٹر اسٹنٹ باریک اسٹنٹ آ رہا ہے۔ اس سے بات کر لینا۔“ ثناء نے فون رکھتے ہوئے ڈھیلے سے انداز میں اکمل کو یاد دلایا۔ وہ سر ہلا کر چلا گیا۔

”پھر بے بالکل پتھر۔“ وہ بڑبڑاتی تھی رائے کو بے ساختہ ہی گد گدی ہوئی۔ کوئی ایسا بھی ہے جو مس ثناء کے حسن کے حضور سجدہ ریزی سے انکاری ہے۔ اسے تجسس سا ہوا۔ پھر سر جھٹک کر اپنے کام میں لگ گئی۔

فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنی چادر اور بیگ سنبھالا اور گیٹ کی طرف چل پڑی۔ سورج ڈھل چکا تھا۔ بس آخری نارنجی کرنیں آسمان پر جلوہ افروز تھیں۔ اسٹاپ گیٹ کے آگے ہی تھا سو وہ گھڑی ہو کر بے تابی سے دائیں طرف نظر گھما کر کسی مزدیادین کا انتظار کرنے لگی۔

اچانک ہی اس کی آنکھیں تھوڑے تھوڑے پھیلتی چلی گئیں۔ وہی ہونڈا سی ڈی سیوٹی اس سے ایک فرلانگ پر دور آ کر رکی تھی۔ گرے سوٹر اور گرے جینز والا وہ مشتبہ شخص بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی نظروں میں مخصوص مواد ایک یا طلب نہیں تھی۔ بہت صاف اور سادہ نظریں تھیں مگر ان میں کھوج اور شکوک لہرا رہے تھے۔ یوں جیسے وہ اس کی یہاں موجودگی کا جواز تلاش کر رہا ہو۔

رائے کی حالت غیر ہونے لگی۔ تو کیا وہ دن بھر اس

کی مگرانی کرتا رہا ہے؟ چاہتا کیا ہے یہ خدائی فہم دار ایسے گھنے اور پراسرار بندے سے تو ٹکر لیتے ہوئے بھی جی بڑتا ہے۔

وہ قدرے رخ موڑ کر بے چینی سے گاڑی کا انتظار کرنے لگی۔ اسی ساعت وہ موٹر سائیکل سوار چہرے ٹانھے رک کر کچھ سوچتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔ بلڈنگ میں داخل ہوئی تو اس کی ہونڈا پہلے سے پارکنگ کے احاطے میں موجود تھی۔ اسے خواہ مخواہ ہی ٹھیک جھننے لگی۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ وہ گھٹے جھلائے ہوئے قدموں سے اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچی تھی۔

”میں نے تم سے کہا تھا جلدی آجانا۔“ امی چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے نرمی سے یاد دلانے لگیں۔ وہ کپڑے بدل کر ڈرائنگ روم کے قالین پر پیر پارے بیٹھی تھی۔ یہ کمرہ کشادہ تھا۔ ایک طرف ایک برانا سا صوفہ سیٹ بچھا تھا اور دوسری طرف دو چار کرسیوں والی چھوٹی سی چوکور میز تھی جہاں بیٹہ کراں بیٹی کھانا کھاتی تھیں۔ ایک کونے میں بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی تھا۔ یہ چیزیں ابو نے یہاں آ کر سینکڑوں خریدی تھیں۔ اسے گھر کا بیش قیمت سامان تو قرض اتارنے میں یک گیا تھا۔

”کوشش تو بہت کی تھی امی۔ مگر کام زیادہ تھا اس لیے۔“ وہ رک کر ماں کو دیکھنے لگی۔ ”آپ گئی تھیں پھر ریا آئی کے ہاں۔“

”ہاں جانا ضروری تھا آخر کو حق ہمسائیگی بھی کوئی چیز ہوتی ہے میرا ارادہ تھا کوئی میٹھی چیز بھی بنا کے لے جاؤں گی مگر نقابست اتنی تھی کہ چوٹھے کے پاس کھڑا ہونا عذاب لگ رہا تھا۔“ امی اپنی وضع داری اور اخلاق سے مجبور تھیں۔ رائے مسکرا دی۔

”آج کیا پکایا ہے؟“

”تمہاری پسند کا مشیر ملاؤ۔“

”زبردست۔“ اس نے نعرہ لگایا۔

”اور امی! ہم کھانا کھا کر واک کرنے چلیں گے۔“

”بہتے سڑک پر ٹریفک کا رش ہوتا ہے اور تم جانتی

”میں جلد نہیں چل سکتی۔“ انہوں نے عذر تراشا۔

”اسلام آباد کی سڑکیں تو رش کے لیے ترستی ہیں۔“

”وہ نہیں بڑی۔“

”ملاؤ ویسے بھی بہت بر سکون اور الگ تھلگ۔“

”گولی رش نہیں ہو گا۔ بس آپ کو چلنا ہے۔“

اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔

”چھاپا بیا۔“ امی بھلا اس کی بات ٹال سکتی تھیں۔

”امی! آپ تھک تو نہیں گئیں؟“

”میں نے کوئی چوتھی مرتبہ تشویش بھری آواز میں دریافت کیا تھا۔ وہ رات کی ٹھنڈی خوشگوار فضا سے جی بھر کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ایک شائق سی رگ و پے میں اترتی ہار رہی تھی۔ مگر اسے پیاراں کا بھی خیال تھا۔

”ہمیں بیٹا میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن ہمیں کافی دیر ہو گئی ہے چل قدمی کرتے ہوئے۔“

”اب واپس چلنا چاہیے۔“ وہ فلیٹ کے آگے پہلی طویل خاموش سڑک کا چکر لگا کر واپس پلٹ آئیں۔

پارکنگ ایریا میں گھما گھما سا اجارا تھا۔ ہونڈا کے پاس سے گزرتے ہوئے نجانے اس کے اندر کون سی

فکرتیں حس جاگی کہ اچانک بہت دور سے موٹر سائیکل کو دوسری طرف دھکا دے کر گرا دیا۔ اس کا

خیال تھا گھاس پر گرنے سے کون سا زیاں تو ہو گا ہو گا

۔ بس یہ ہے کہ موصوف صبح اٹھ کر بائیک کو لبا لپٹے

دیکھ کر چیخ و ملب ضرور کھائیں گے اور آگے بڑھنے

سے بیک واپس مرنوٹ جائے تو سو ہی آجائے۔ مگر

وہ سراسر حیران کر دینے والا تھا۔

”ف۔“ ضبط سے بے حال ہوتی ایک چیز مواد

تواڑنے اس کے قدموں تلے سے زمین سرکھائی۔

”کیا ہوا؟“ اس کے چلتی امی گھبرا کر مڑی تھیں۔

”مے لینا پکڑنا ہو۔“ وہ بری طرح بے اوسان ہو

کر اس طرف لگی تھیں۔ وہ موصوف غالباً ”دوسری

طرف بیٹھے موٹر بائیک کا کوئی کل پر نہ چپک کر رہے

تھے جو اچانک نذر دار دھکا لگنے سے موٹر بائیک کے

نیچے آ گئے۔ وہ تو اللہ نے بچت کی جو اسے بروقت چو

کھیا کر قدرے بچے رہ گئے کا موقع مل گیا تھا۔ یوں ہی

جسم تو محفوظ رہا مگر دائیں ٹانگ پوری کی پوری سچے آگئی

تھی۔

صورتحال کی یقینی کا اندازہ کرتے ہی رائے کے

ہوش اڑ گئے۔ اس کے وہ ہوش و حواس میں بھی نہیں تھا کہ

بائیک کی دوسری طرف نہ بیٹھا ہوا سب بلڈنگ کے

نچلے فلور کی کھلی کھڑکی سے ایک صاحب جھانک کر

فتفت باہر نکل آئے تھے۔ انہوں نے بائیک اٹھا کر

اسٹینڈ پر کھڑا کرنے کے بعد زمین پر لیٹے اس شخص کو

سارا دے کر اٹھایا۔

”زیاں چوٹ تو نہیں آئی بیٹے ورنہ ہسپتال لے

چلیں۔“

ایسی اس کے پاس بیٹھ کر فکر مندی سے پوچھنے

لگیں۔

”میں تھک ہوں خاتون۔“ وہ لچلا ہونٹ دبا کر

تکلیف ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کرنے

والے صاحب نے اپنی گھروالی کو کھڑکی سے پیچھا دے

کر ایک صاف کپڑا ڈھیل ڈھیل اور کوئی مرہم لٹکوا دیا تھا۔

عالمی ”فرسٹ ایڈ“ کے ماہر تھے۔ کچھ دیر بعد اس کے

زخمی ٹخنے اور پیر کا فون صاف کر کے پٹی باندھ دی گئی تھی

۔ امی اتنی دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہیں۔ کچھ طور

کے کچھ بچے بھی تماشا دیکھنے آ گئے تھے۔ قیمت تھاجو

کسی کو اصل سبب معلوم نہیں ہوا تھا۔ سب اسے

انقلابی حادثہ خیال کر رہے تھے۔

”ملاؤ۔ سوچنے کی بات ہے مہیا خود بخود کسی جن

نے موٹر بائیک اس پر الٹا دی؟“ وہ بلڈنگ کی دروازے

کی کارروائی ملاحظہ کرتے ہوئے دل ہی دل میں

حاضرین کی کمر نشی بہ محفوظ ہو رہی تھی۔

”آپ کا کمرہ محترم۔“ وہ نظر اٹھا ہوا اٹھ کھڑا ہوا

تھا۔ بعد غالباً قدرتی طور پر روکھا اور پات تھاجو تھکر

کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بھی بدلتے سے لاجپار

رہا تھا۔ رائے نے سوجا۔

”خیال سے بیٹے اگر خود چلنے میں تکلیف محسوس

کر رہے ہو تو اس میں بیٹا سارا دے کر لے جائے۔“ امی

اس کی چال دیکھ کر فطری رحمتی کے ہاتھوں ہی طرح

نیچے آ گئے۔ وہ تو اللہ نے بچت کی جو اسے بروقت چو

کھیا کر قدرے بچے رہ گئے کا موقع مل گیا تھا۔ یوں ہی

جسم تو محفوظ رہا مگر دائیں ٹانگ پوری کی پوری سچے آگئی

تھی۔

صورتحال کی یقینی کا اندازہ کرتے ہی رائے کے

ہوش اڑ گئے۔ اس کے وہ ہوش و حواس میں بھی نہیں تھا کہ

بائیک کی دوسری طرف نہ بیٹھا ہوا سب بلڈنگ کے

نچلے فلور کی کھلی کھڑکی سے ایک صاحب جھانک کر

فتفت باہر نکل آئے تھے۔ انہوں نے بائیک اٹھا کر

اسٹینڈ پر کھڑا کرنے کے بعد زمین پر لیٹے اس شخص کو

سارا دے کر اٹھایا۔

”زیاں چوٹ تو نہیں آئی بیٹے ورنہ ہسپتال لے

چلیں۔“

ایسی اس کے پاس بیٹھ کر فکر مندی سے پوچھنے

لگیں۔

”میں تھک ہوں خاتون۔“ وہ لچلا ہونٹ دبا کر

تکلیف ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کرنے

والے صاحب نے اپنی گھروالی کو کھڑکی سے پیچھا دے

کر ایک صاف کپڑا ڈھیل ڈھیل اور کوئی مرہم لٹکوا دیا تھا۔

عالمی ”فرسٹ ایڈ“ کے ماہر تھے۔ کچھ دیر بعد اس کے

زخمی ٹخنے اور پیر کا فون صاف کر کے پٹی باندھ دی گئی تھی

۔ امی اتنی دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہیں۔ کچھ طور

کے کچھ بچے بھی تماشا دیکھنے آ گئے تھے۔ قیمت تھاجو

کسی کو اصل سبب معلوم نہیں ہوا تھا۔ سب اسے

انقلابی حادثہ خیال کر رہے تھے۔

”ملاؤ۔ سوچنے کی بات ہے مہیا خود بخود کسی جن

نے موٹر بائیک اس پر الٹا دی؟“ وہ بلڈنگ کی دروازے

کی کارروائی ملاحظہ کرتے ہوئے دل ہی دل میں

حاضرین کی کمر نشی بہ محفوظ ہو رہی تھی۔

”آپ کا کمرہ محترم۔“ وہ نظر اٹھا ہوا اٹھ کھڑا ہوا

تھا۔ بعد غالباً قدرتی طور پر روکھا اور پات تھاجو تھکر

کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بھی بدلتے سے لاجپار

رہا تھا۔ رائے نے سوجا۔

”خیال سے بیٹے اگر خود چلنے میں تکلیف محسوس

کر رہے ہو تو اس میں بیٹا سارا دے کر لے جائے۔“ امی

اس کی چال دیکھ کر فطری رحمتی کے ہاتھوں ہی طرح

نیچے آ گئے۔ وہ تو اللہ نے بچت کی جو اسے بروقت چو

کھیا کر قدرے بچے رہ گئے کا موقع مل گیا تھا۔ یوں ہی

جسم تو محفوظ رہا مگر دائیں ٹانگ پوری کی پوری سچے آگئی

تھی۔

صورتحال کی یقینی کا اندازہ کرتے ہی رائے کے

ہوش اڑ گئے۔ اس کے وہ ہوش و حواس میں بھی نہیں تھا کہ

بائیک کی دوسری طرف نہ بیٹھا ہوا سب بلڈنگ کے

نچلے فلور کی کھلی کھڑکی سے ایک صاحب جھانک کر

فتفت باہر نکل آئے تھے۔ انہوں نے بائیک اٹھا کر

اسٹینڈ پر کھڑا کرنے کے بعد زمین پر لیٹے اس شخص کو

سارا دے کر اٹھایا۔

”زیاں چوٹ تو نہیں آئی بیٹے ورنہ ہسپتال لے

چلیں۔“

ایسی اس کے پاس بیٹھ کر فکر مندی سے پوچھنے

لگیں۔

”میں تھک ہوں خاتون۔“ وہ لچلا ہونٹ دبا کر

تکلیف ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کرنے

والے صاحب نے اپنی گھروالی کو کھڑکی سے پیچھا دے

کر ایک صاف کپڑا ڈھیل ڈھیل اور کوئی مرہم لٹکوا دیا تھا۔

عالمی ”فرسٹ ایڈ“ کے ماہر تھے۔ کچھ دیر بعد اس کے

زخمی ٹخنے اور پیر کا فون صاف کر کے پٹی باندھ دی گئی تھی

۔ امی اتنی دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہیں۔ کچھ طور

کے کچھ بچے بھی تماشا دیکھنے آ گئے تھے۔ قیمت تھاجو

کسی کو اصل سبب معلوم نہیں ہوا تھا۔ سب اسے

انقلابی حادثہ خیال کر رہے تھے۔

”ملاؤ۔ سوچنے کی بات ہے مہیا خود بخود کسی جن

نے موٹر بائیک اس پر الٹا دی؟“ وہ بلڈنگ کی دروازے

کی کارروائی ملاحظہ کرتے ہوئے دل ہی دل میں

حاضرین کی کمر نشی بہ محفوظ ہو رہی تھی۔

”آپ کا کمرہ محترم۔“ وہ نظر اٹھا ہوا اٹھ کھڑا ہوا

تھا۔ بعد غالباً قدرتی طور پر روکھا اور پات تھاجو تھکر

کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بھی بدلتے سے لاجپار

رہا تھا۔ رائے نے سوجا۔

”خیال سے بیٹے اگر خود چلنے میں تکلیف محسوس

کر رہے ہو تو اس میں بیٹا سارا دے کر لے جائے۔“ امی

اس کی چال دیکھ کر فطری رحمتی کے ہاتھوں ہی طرح

نیچے آ گئے۔ وہ تو اللہ نے بچت کی جو اسے بروقت چو

کھیا کر قدرے بچے رہ گئے کا موقع مل گیا تھا۔ یوں ہی

جسم تو محفوظ رہا مگر دائیں ٹانگ پوری کی پوری سچے آگئی

تھی۔

صورتحال کی یقینی کا اندازہ کرتے ہی رائے کے

ہوش اڑ گئے۔ اس کے وہ ہوش و حواس میں بھی نہیں تھا کہ

بائیک کی دوسری طرف نہ بیٹھا ہوا سب بلڈنگ کے

نچلے فلور کی کھلی کھڑکی سے ایک صاحب جھانک کر

فتفت باہر نکل آئے تھے۔ انہوں نے بائیک اٹھا کر

اسٹینڈ پر کھڑا کرنے کے بعد زمین پر لیٹے اس شخص کو

سارا دے کر اٹھایا۔

”زیاں چوٹ تو نہیں آئی بیٹے ورنہ ہسپتال لے

چلیں۔“

ایسی اس کے پاس بیٹھ کر فکر مندی سے پوچھنے

لگیں۔

”میں تھک ہوں خاتون۔“ وہ لچلا ہونٹ دبا کر

تکلیف ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کرنے

والے صاحب نے اپنی گھروالی کو کھڑکی سے پیچھا دے

کر ایک صاف کپڑا ڈھیل ڈھیل اور کوئی مرہم لٹکوا دیا تھا۔

عالمی ”فرسٹ ایڈ“ کے ماہر تھے۔ کچھ دیر بعد اس کے

زخمی ٹخنے اور پیر کا فون صاف کر کے پٹی باندھ دی گئی تھی

۔ امی اتنی دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہیں۔ کچھ طور

کے کچھ بچے بھی تماشا دیکھنے آ گئے تھے۔ قیمت تھاجو

کسی کو اصل سبب معلوم نہیں ہوا تھا۔ سب اسے

انقلابی حادثہ خیال کر رہے تھے۔

”ملاؤ۔ سوچنے کی بات ہے مہیا خود بخود کسی جن

نے موٹر بائیک اس پر الٹا دی؟“ وہ بلڈنگ کی دروازے

کی کارروائی ملاحظہ کرتے ہوئے دل ہی دل میں

حاضرین کی کمر نشی بہ محفوظ ہو رہی تھی۔

”آپ کا کمرہ محترم۔“ وہ نظر اٹھا ہوا اٹھ کھڑا ہوا

تھا۔ بعد غالباً قدرتی طور پر روکھا اور پات تھاجو تھکر

کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بھی بدلتے سے لاجپار

رہا تھا۔ رائے نے سوجا۔

”خیال سے بیٹے اگر خود چلنے میں تکلیف محسوس

کر رہے ہو تو اس میں بیٹا سارا دے کر لے جائے۔“ امی

اس کی چال دیکھ کر فطری رحمتی کے ہاتھوں ہی طرح

نیچے آ گئے۔ وہ تو اللہ نے بچت کی جو اسے بروقت چو

کھیا کر قدرے بچے رہ گئے کا موقع مل گیا تھا۔ یوں ہی

جسم تو محفوظ رہا مگر دائیں ٹانگ پوری کی پوری سچے آگئی

تھی۔

صورتحال کی یقینی کا اندازہ کرتے ہی رائے کے

ہوش اڑ گئے۔ اس کے وہ ہوش و حواس میں بھی نہیں تھا کہ

بائیک کی دوسری طرف نہ بیٹھا ہوا سب بلڈنگ کے

نچ

بے چین ہو گئیں۔ الیاس غالباً "ان صاحب کا نام تھا جنہوں نے اس کی مدد کی تھی۔"

اس کے قطعی انداز پر ای چپ ہو گئیں۔ "آئیں ای! ہم بھی چلیں۔" وہ انہیں اشارہ کرتی ہوئی تیزی سے اوپر چڑھ گئی۔ اسی غالباً "بیچے ہی رک گئی تھیں الیاس کی بیوی کے پاس۔"

رائے پانچویں منزل پر پہنچ کر اپنے فلیٹ کا تالہ کھول رہی تھی جب وہ رنگ کے سارے یہاں تک پہنچا۔ اس کا فلیٹ چھٹی اور آخری منزل پر تھا۔ اسے آتا دیکھ کر رائے کا خون خشک ہو گیا۔

"وہ۔ بات سنیں۔" وہ سوکھے لبوں پر ہونٹ پھیرتے ہوئے معذرت کے لیے مناسب ترین الفاظ ڈھونڈنے لگی۔

"سمجھ لوں گا میں آپ سے۔" اس نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کے یہاں آتے ہی اویبا کی ظالم دلوں اور خوشبو نے فضا کا احاطہ کر لیا تھا۔ وہ اس کے پاس سے گزرتا ہوا اگلی منزل کی سیڑھی پر قدم رکھنے کے بعد ایک لحظے کو مڑا۔

"زیادہ نہیں مار خان بننے سے پہلے اپنے اطراف سے ہو سنا رہنا سیکھیں ورنہ نقصان اٹھائیں گی۔" وہ اکھڑے ہوئے بے نیاز سے انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

وہ جو اس کی دھمکی پر پتھر کر رہی تھی۔ اس عجیب و غریب تنبیہ پر شدید کھڑی اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

وہ کیا کہہ رہا تھا اور کس حوالے سے؟ وہ ایک نئی مصیبت میں پڑ گئی۔

"بہت افسوس کی بات ہے رائے! مجھے تم سے ایسی شرارت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اگر خدا خواستہ وہ زیادہ زخمی ہو جاتا یا اسے فریاد ہو جاتا تو پھر؟" اسی جب اتنا ہی غصے میں ہوتی تھیں تو اسے پورے نام سے مخاطب کرتی تھیں۔

"آئی وہ۔" وہ کانٹا کھانے لگی۔ اس کی حرکت سب سے چھپ گئی تھی۔ مگر وہ بہر حال اس کی ماں

تھیں۔ تم تک پہنچ گئی تھیں کہ اس نے جان بوجھ کر پائیک کو فکرماری تھی۔

"اگر اس کی ماں یا بیوی کو خبر ہو گئی تو وہ پوری جلد گھر میں ہمارا تماشا بنا دیں گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔ اتنی بدگھظ اور بد تمیز لڑکی ہے کہ انسان کی جان لینے کے درپے ہو گئی۔" اسی کا موڈ بہت بگڑا ہوا تھا۔ اس نے بڑی مشکوک سے انہیں ٹھنڈا کیا۔

♥ ♥ ♥ ♥
"ارے فرمان صاحب! کیوں خفا ہوتے ہیں جناب آپ حکم کیجیے۔ ہم خود سر کے بل آجائے ہیں آپ کا موڈ ٹھیک کرنے۔" شاہنشاہنہس کر فون پر بات کر رہی تھی۔

"نہیں اس نے دوبارہ جانے سے انکار کر دیا ہے۔ سمجھا کریں ناں پاس خواہ مخواہ دباؤ ڈال کر اپنی کمپنی کی ساکھ اور آج خراب نہیں کرنا چاہتے۔ وہ آپ کو بہت بھانپتی ہے۔ مانتے ہیں مگر دیکھیے ناں۔ ہر کمپنی کے کچھ اصول ہوا کرتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کرنے لگیں تو ہماری ساکھ خراب ہوگی۔" وہ سلیطے طریقے سے سمجھا رہی تھی۔

"اوکے۔ اب آپ نے ہمارا اتنا مال خریدنے کا وعدہ کیا ہے تو پھر کچھ سوچنا پڑے گا۔ اچھا یہ بتائیے آپ کی رہائش کس علاقے میں ہے اور آپ کن اوقات میں گھر پر پائے جاتے ہیں؟ نیز یہ کہ آپ کے گھر میں کون کون رہتا ہے۔" وہ تفصیلات نوٹ کرتی رہی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔ لیکن آگے معاملہ سنبھالنا آپ کی ذمہ داری ہے ہم پر کوئی الزام نہیں اتنا چاہیے۔" اس نے فون رکھ دیا۔

رائے ایک اتنی الماری کھولے اس میں سر دیے کھڑی تھی۔ گفتگو کا کچھ حصہ پہلے پڑا تھا جسے اس نے غیر اہم جان کر توجہ نہ دی۔

"طاہرہ! اسفند صاحب کو بلاؤ فیکٹری سے۔" ثناء نے میز صاف کرتی طاہرہ سے کہا۔

"وہ جی وہ تو آج نہیں آئے؟" اس نے واپس آکر اطلاع دی۔

"کمال ہے۔ موصوف نے پاس کو تائے بغیر چھٹی کر لی؟" وہ پیشانی پر گڑبڑی ہوئی تشویش سے بولی۔ پھر کچھ صبح کر فون ملانے لگی۔

"میلویہ میں ہوں شاکیوں بھی فیکٹری نہیں آئے۔" ثناء کے لمحے میں محسوس کی جانے والی اپنائیت اور فکرتھی تھی۔

"چھا میں سر سے کہہ دوں گی۔ ویسے برائے مانو تو میں آجاؤں تمہارے گھر؟"

جناب یقیناً "خفت اور نفی میں تھا جو اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

"شاید میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔" اس نے تھکے ہوئے انداز میں کریڈل پر ریسیور رکھ دیا۔ اسی لمحے پاس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ان کے ایک ہاتھ میں بریف کیس تھا اور دوسرے میں گاڑی کی چابی۔

"آپ میرے ساتھ چلیے مس ثناء! ایک اہم میٹنگ ہے۔" وہ سنجیدگی سے اسے کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

"طیس سر۔" ثناء مستعدی سے پیچھے آگئی۔ رائے نے پوچھی سرسری سے انداز میں دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ سرائیکٹر شاہ کو ہمراہ لے کر میٹنگ پر جاتے تھے۔ ان کی عمر پینتالیس سے اڑتالیس برس کے درمیان تھی۔ سر کے گرے بال ان پر بہت سوٹ کرتے تھے۔ ان کا چہرہ صحت مندی کی سرخی لیے ہوئے تھا۔

"خالہ! ایک بات تو بتاؤ۔ یہ مس ثناء کا اسفند یار صاحب کے ساتھ کوئی چکر ہے؟" رائے اس مزاج کی لڑکی تو نہیں تھی۔ مگر وہ عین مرتبہ شاہ کو اس شخص کے لیے بیک وقت بے قرار اور جھنجھلائی ہوئی دیکھ چکی تھی سو ایسا خیال آنا فطری امر تھا۔

"ارے لی لی! اس عورت کا کسی کے ساتھ چکر نہیں ہے۔ طبیعت ہی ماشاء اللہ ایسی پاک ہے۔" طاہرہ اکتائی ہوئی آواز میں بولی۔

"اب ایسا قبر تو نہ توڑو۔" ثناء ایک محنتی اور ہوشیار لڑکی ہے۔ برس ہا برس سے پاس کے ساتھ کام کر رہی ہے آفس کا اتنا کام سنبھالا ہوا ہے یہ بتاؤ یہ اسفند یار

صاحب کون ہیں کیسے آئی ہیں۔" اس نے طاہرہ کا اعتراض رد کر دیا۔

"بہت بھلا مانس ہے کم از کم زمانوں کے پیچھے نہیں بھاگتا۔" طاہرہ نے جیسے بڑی سچے کی خولی بتائی۔ "چپ چاپ اپنا کام کر رہا ہے اور واپس چلا جاتا ہے عورت تو عورت وہ تو سادھی مردوں سے بھی غلنے پنے جملوں سے زیادہ بات نہیں کرتا۔"

"اور بھی رائے! کہاں ہو تم؟" لیاقت صاحب اسے ڈھونڈتے ہوئے ادھر آگئے۔

"مجھے کہاں جانا ہے سر! آپ کام بتائیے۔" اس نے بیزار کن انداز میں ان کا چہرہ دیکھا۔

"ککل تمہیں ایف مین کی طرف جانا ہو گا تمہاری حسب نشاء تمہیں ریڑی فوڈنشل ایریا دے دیا گیا ہے اب تو خوش ہو۔" وہ خوشاند انداز میں ہنسے۔ وہ کسی بھی طرح اس کو اپنی ممنون اور زیر بار نہ بھنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ ان سے مسکرا مسکرا کر لگاؤٹ سے بات کرے۔ محمور نظروں سے انہیں دیکھے۔ اس سے زیادہ کی انہیں تمنا بھی نہیں تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥
"آج تو بڑی جلدی آگئیں؟" اسی اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھیں۔

"آج میں کمپنی کے دفتر میں ہی رہی تھی۔ باہر کا کام نہیں تھا۔ لیکن سے بڑی خوشبو میں اٹھ رہی ہیں کیا بتانا ہے؟" اس کو جتنس لاحق ہوا لیکن میں کھس کر دیکھی میں جھانکا اور بھنے ہوئے چکن میں سے ایک پس نکال لیا وہ سرے دیکھی میں سویا بن رہی تھیں۔

"لگتا ہے آج میری دعوت کرنے کے سوڈ میں ہیں۔ ویسے یہ آپ میں خاصی مثبت تبدیلی رونما ہوئی ہے۔" وہ شرارت سے ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر چیت لگائی۔

"نمدیدی کہیں کی۔ میں کب تمہاری فرمائش مانتی ہوں ویسے یہ دعوت تمہاری نہیں کسی اور کی ہے۔" ہنگون؟

"وہی بچہ جو کل تمہاری شرارت و حماقت کے نتیجے

میں زخمی ہوا تھا۔ میں نے سوچا اس طرح حق ہر سائیکل بھی ادا ہو جائے گا اور اسی بہانے تمہاری حرکت کی تلافی بھی ہو جائے گی۔ سوچا ایک جا میں تو اوپر دے آئیں گے۔ تم بھی چلتا میرے ساتھ۔

”آپ بھی حد کرتی ہیں ای! بھلا اس کے گھر میں کوئی نہیں ہے اس کی تیمارداری کرنے والا اور اس طرح اچھا نہیں لگتا۔ وہ کیا کہیں گے کہ بھلا ہم اپنے بچے کو چکن اور سویاں پینا کے سیر دے سکتے ہیں؟“ وہ کوفت بھرے انداز میں تبصرہ کرنے لگی۔ مگر ای نے چنداں کان نہ دھرے۔

”وہ کچھ بھی کہیں اپنا فرض پورا کر کے ہم تو اپنے منہ کے آگے سرخرو ہو جائیں گے چلو تم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔“

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر سر ہلا دیا۔ جانتی تھی اپنی نرم مزاج والی ماں کو سمجھانا بے کار تھا۔

”کیا خبر مجھے سامنے دیکھ کر اسے زخموں پہ ٹمک چھڑکنے والا محاورہ یاد آجائے؟“

جائے سے پہلے اس نے بار بار سوچا تھا۔

”جو بیٹی! اس کا نام کیا تھا بھلا۔“ ”موا“ ای بیڑھیاں چڑھتے ہوئے سرگوشیاں انداز میں مخاطب ہوئیں۔

”تو مجھے بھی نہیں پتا ای۔ میں اپنی سولت کے لیے انہیں موصوف کہہ لیا کرتی ہوں۔“ اس کی مصحوبیت پر ای ہنس پڑیں۔

بار بار ٹیل بجانے کے بعد دروازہ کھلا تھا۔

دروازہ اسی نے کھولا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور کچھ زرد زرد سا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال بے ترتیب تھے اور سفید شلوار قمیض پر سلو میں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ دن سے کپڑے نہیں بدلے گئے۔ آنکھیں یقیناً بخار سے لال ہو رہی تھیں۔ بلکہ کھڑی ناک بھی قدرے لال تھی۔

”آ۔ آپ۔“ وہ انہیں سامنے پا کر سچ چکر اگیا تھا۔

”میں آپ کا حال دریافت کرنے آئی ہوں بیٹی۔“

ڈالے ای بڑے غلوں سے گویا ہوئیں۔

”جی پلینز تعریف لائیے۔“ وہ تہذیب کے عالم میں ایک طرف ہو گیا۔ اس کی آواز بھی کچھ بھاری بھاری لگ رہی تھی۔

”تمہارا زخم کیسا ہے بیٹی؟“

”اس میں سوچن ہو گئی ہے۔“ وہ انہیں ڈراٹنگ روم میں لے آیا۔ بے حد خوب صورت اور پیش قیمت غیر ملکی اشیاء سے سجائے کمرہ اپنے کچھن کی خوش حلالی منانے دے رہا تھا۔ ماحول میں انہی کی مخصوص خوشبو چھٹی تھی۔

”یہ اپنی ای گویا بیوی کو پکڑا دینے اور تم جا کر آرام کرو۔ ہم بھی بس دو چار منٹ بیٹھیں گے۔“ ای خطر نظروں سے اوجھڑا دیکھ رہی تھیں۔

”آپ اوجھڑی رکھ دیجیے۔ لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی۔“

اس نے ان کے ہاتھ سے ٹہلے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

”میں اپنی خوشی سے بنا کر لائی ہوں۔ انکار نہ کرنا۔ اپنی ای کو بلاؤ بیٹی۔“

”مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کو ان سے نہیں ملوا سکتا۔ میرے والدین کی وفات کو تیس برس گزر چکے ہیں۔“ اس نے بہت سنجیدگی و سادگی سے جواب دیا۔

”ہائیں۔“ ای کو دھچکا لگا۔ ”کوئی بہن بھائی بھی نہیں ہے۔“

”نہیں۔“ میں اس وقت چھ ماہ کا تھا جب ایک ایکسپلنٹ میں والدین کا انتقال ہوا۔“

وہ سیاہ سے خالی خالی لب و لہجے میں گویا ہوا۔ زخم اتار پانا تھا کہ اب نشان بھی مندمل ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ ر سکون تھا۔ یا سیلف کنٹرول ہی اتنا تھا کہ مخاطب کو اس کے رویے میں احساس محرومی اور رنجیدگی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

”تو پھر تمہیں کس نے پالا۔“ ای کا دل گویا پھل کر پانی بن گیا تھا۔

وہ اب خصوصی توجہ و شفقت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”میں۔“ جیم خانے میں پلا بڑھا ہوں۔ اٹھارہ سال کی عمر سے کام لگ گیا۔ اپنے پیروں۔ کھڑا ہوا تو تھیم لگتا۔ چھوڑ کر گرائے پر کمرہ لے لیا۔ اللہ کا کرم ہے۔

”جیمے ملازمت کرتے ہوئے بارہ برس گزر چکے ہیں۔ یہ فلیٹ اور گھر کا ساز و سامان میں نے اپنی کمائی سے خریدا ہے۔“

”عقرب اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ نجائے کس دھن میں وہ سڑیل مزاج کھوڑا سا بندہ تفصیلی گفتگو کر رہا تھا۔ ای کی بیٹی کو ترسی ہاستا اس پر قربان ہوئی جا رہی تھی۔

”تمہارے کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھے بیٹا۔“

”انہوں نے ہی جیم خانے کی راہ دکھائی تھی۔“

اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔

”خدا کسی کو اپنوں کے دکھ نہ دکھائے۔“ ای نے ٹھنڈی سانس بھر کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔

”تمہارے بیوی بچے؟“

”مگر شادی کرتا تو ضرور ہوتے۔ مجھے افسوس ہے۔“ وہ بڑے تکلف سے مسکرایا تھا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بڑی اجنبی اور عجیب نظر آ رہی تھی۔

”ہاں بھی کوئی بزرگ سر پر ہو تو بندہ ایسی خوشیاں دیکھتا ہے۔ خود بخود تو نہیں ہو جاتی شادی۔ خیر تم جی چھوٹا نہ کرو۔ مجھے پتا ہوتا کہ تم لاچار ہیں ایسے بڑے ہو تو مع ہی آجاتی کھانے کا پوچھنے۔ میں روٹی اس لیے نہیں ساتھ لایا۔“

”اب تم آرام سے بیٹھ کر کھانا شروع کرو میں ایک منٹ میں پکا کر لائی ہوں۔“

اس سے پہلے کہ وہ انہیں روکتا۔ ای عجلت میں اٹھ کر باہر چل دیں۔ ان کی متانے ایسا جوش مارا تھا کہ پلٹ کر رائے کو دیکھنے کا بھی خیال نہ آیا۔ وہ جزیب سی کر رہی تھی حیران پریشان انہیں جا۔ تو دیکھنے لگی۔ آیا وہ بھی اٹھ کر پیچھے جائے یا یہاں رک کر ان کا انتظار کرے۔ اسی تہذیب میں وہ بیٹی کی بیٹی بن گئی۔

”آپ کی ای بہت جذباتی ہیں۔“ وہ جو انہیں روکنے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔ اب شکایتی انداز

میں بیٹی سے مخاطب ہو کر جھلجھلک رہا تھا۔ وہ

چپ رہی۔ اس کے نادر خیال کے جواب میں کیا کہی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا۔“ اپنے اطراف سے ہوشیار رہے گا۔“ اس کے لہجے کی جارحیت اور ناراٹھگی رائے کو چونکا گئی۔

”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی؟“

”آپ نے گردن قابو والے لوگ پھرتے ہیں۔ ہوشیاری نہ دکھائی تو ان کے جال میں پھنس جائیں گی۔“ اس کی آواز میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا۔

کمال ہے اسے میری جاب یا سلامتی سے کیا مطلب۔

”مجھے دوست دشمن کی پہچان ہے۔“ وہ برلمان

میں سی لے کر کہتا ہوں کہ خواہ مخواہ تمہیں مار خان بنتی ہیں۔ دور کا دشمن دیکھ لیتی ہیں۔ مگر سامنے والے کو

تمہیں پہچان سکتیں۔ وار کرنے والا بیا اوقات میں آنکھوں کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ مگر اسے شناخت کرنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔“ اسے یوں لگا جیسے وہ اسے پیدا سیدھا حاسن قرار دے رہا ہے۔

”آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بگڑ کر بولی۔

”مرضی ہے آپ کی۔“ پچھتائے سے پہلے کی تکلف برداشت کر لیتا زیادہ بہتر ہوتا ہے بعد میں سر پکڑ کر رونے سے۔ لیکن آپ کو شوق ہے ذاتی تجربے کا بہر حال میں کیا کر سکتا ہوں۔“ اس نے رکھائی سے کندھے اچکا دیے۔ اسی دوران ای گرم گرم روٹی چنگیر میں رکھے واپس آ گئی تھیں۔

اس واقعے کو بندہ دن گزر چکے تھے۔ اس کاٹوں تیسرے دن ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔ رائے نے بھی شکر کی سانس لی۔ ورنہ ای نے جو تیمارداری کا شیڈول بنالیا تھا۔ اس کی وجہ سے گھر پر دو مہینہ خاصی متاثر ہوئی تھی۔

صبح کا ناشتہ دوپہر اور پھر رات کا کھانا۔ رائے اس روز

13

کے بعد دوبارہ امی کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ یوں بھی ایک چھترے چھانٹ مرو کے پاس جانے کا جواز بھی نہیں بنتا تھا۔ امی تو خیر اپنی اخلاقیات اور متا سے مجبور تھیں سو اس کے اچھی طرح ٹھیک ہو جانے تک یا قاعدہ کی سے خبر گیری کرتی رہیں بعد میں وہ بھی دوبارہ نہ گئیں۔ یوں بھی وہ موصوف صبح کے نکلے شام گئے گھر لوٹتے تھے۔

رائہ کو آج ایف ایون جانا تھا۔ پرسوں اسے پہلی تنخواہ ملی تھی اور شانے تنخواہ دیتے ہوئے اسے ڈیوٹی اریا بتایا تھا۔

”تقریباً“ ایک بجے کے قریب جانا۔ اس سے پہلے تو یہاں کی بیگمات کی دینیے بھی آنکھ نہیں کھلتی ہوگی۔“ نہ جانے کیوں رائہ اس کام سے مطمئن نہیں تھی۔ ایک ماہ سے زائد ہو گیا تھا مگر وہ ابھی تک خود کو پہنی در کرز اور ماحول کے ساتھ ایڈجسٹ نہ کر پائی تھی۔ اسے اپنا آپ اپنی سالگت۔ یوں جیسے وہ کسی غلط جگہ پر آگئی ہے۔ ان لوگوں کے درمیان ہے جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے۔ وہ کام کر رہی ہے جو اس جیسی لڑکی پر سوٹ نہیں کرنا۔

سفید جیسے سے گھر کی تیل بجاتے ہوئے وہ خاصی ابھی ہوئی تھی۔ ملازم نے دروازہ کھولا۔ اس نے اپنا اور اپنی کا تعارف کرائے کے بعد بیگم صاحبہ کو اطلاع دینے کو کہا۔

”آپ اندر آجائیے۔“ ملازم نے واپس آکر سوہانہ کہا۔

”ایک تو محترماتوں کو یہاں تک جلتے ہوئے موت آتی ہے۔“ وہ تھکاتے ہوئے اندر آگئی۔ ملازم اپنی رہنمائی میں اسے ایک پر شکوہ کمرے میں چھوڑ کر دروازہ بند کر کے باہر چلا گیا۔ اسی لمحے دوبارہ دروازہ کھلا۔

”وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔“ جانی پہچانی شانت آواز پر اس نے گردن گھمائی اور پھر جیسے پوری ہمت اس پر آ رہی۔

سیاہ عمری پس سوٹ میں فرمان بڑی نشی مسکان سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ! یہ آپ کا گھر ہے؟“ اس کے سوکے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”جی ہاں! یہ میرا غریب خانہ ہے۔ صد شکر کہ آپ نے روٹی تو بخشی۔ میں کب سے آپ کا منتظر تھا۔“ اس کی آنکھوں اور لہجے سے آج پھوٹی محسوس ہو رہی تھی۔ رائہ غیر محسوس انداز میں چند قدم پیچھے سرک گئی۔

”دور نہیں ہے لی کم آن!“ اس کا مخمور لہجہ سرگوشیانہ ہو گیا۔ وہ اتنا نزدیک آگیا تھا کہ بچے نکلنے کا راستہ نہ رہا تھا۔ رائہ کی خوف سے اپنی آنکھیں مضطربانہ انداز میں ادھر ادھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”درا اپنا ہاتھ دیں مجھے۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔

اسی لمحے رائہ کے ذہن میں آگیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ سائڈ نیبل پر رکھا پینٹل کا بڑا سا گلدان اٹھانے میں محض ایک سیکنڈ ہی صرف ہوا تھا۔ اگلے منٹ میں وہ پوری قوت سے فرمان کی پیشانی پر لگا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ ڈکراتے ہوئے جانور کی طرح قائلین پر لڑھک گیا۔ اس کی پیشانی چوڑا اور گردن خون سے رنگین ہو چکے تھے۔

رائہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گلدان دوبارہ اپنی جگہ پر رکھا اور خود کو ٹھینے ہوئے جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تھی۔ بدحواسی میں وہ اپنا بیگ بھی وہیں چھوڑ آئی تھی۔ گیٹ پر موجود جو کدو نے حیرانی سے اسے تقریباً بھاگتے ہوئے نکلنے دیکھا تھا جتنی دیر میں وہ صورت حال سمجھ کر اس کے پیچھے آتا وہ مارکیٹ والی بوڈیز پر ٹرن لے چکی تھی۔

”اللہ میاں کوئی ٹیکسی مل جائے۔“ وہ جلد از جلد اس سیکڑے دور ہونا چاہتی تھی۔

معاہودہ اسی ڈی سیوٹی پوری رفتار سے اس کے قریب آکر رہی۔

”چلو بیٹھو۔“ اس کا لہجہ کھردرا اور مضطرب تھا۔ رائہ نے فیصلہ کرنے میں ایک سیکنڈ کی بھی مہلت نہ لی اور جیسے تیسے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ گو کہ یہ بھی رسک ہی تھا۔ وہ شخص بھی اچھی تھا اور اس کے

خلاف خاصے جارحانہ تیور رکھتا تھا۔ مگر جان و آبرو بچانے کے لیے اس نے نسبتاً کم خطرناک راستے کا انتخاب کر لیا۔ اگر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی رہتی تو فرمان کے بندوں کے ہاتھ لگنا مشکل نہیں تھا۔

خدا جانے وہ مردود مر گیا ہے یا؟ اور اگر سچ سچ وہ ہلاک ہو گیا تو؟ اسے سوچ کر ہی جھرجھری آگئی۔ مجھے کیا خبر تھی اس ایریا میں اس کی رہائش گاہ ہوگی۔ جلد ہی وہ لوگ پشاور موڑ بیچ گئے۔ مارکیٹ کے قریب کابل ریٹورنٹ کے آگے اس نے بائیک روک دی۔

”چلو آؤ۔“

”مم۔ میں نہیں اتروں گی۔ مجھے اپنے سانس جانا ہے۔“

”مجھے بھی غیر عورتوں کو ساتھ لے کر ہوٹلوں میں خوار ہونے کا شوق نہیں ہے کچھ بات کرنا ہے تم سے۔“ اب کیا چور ہے پر کھڑا ہو جاؤں تمہارے ساتھ؟“ وہ برس پڑا۔ رائہ گڑبڑا کر اس کے ہمراہ اندر آگئی۔ دل ہی دل میں جل بھن رہی تھی۔ بھلا میں کیوں خواجہ خواہ موصوف کے رعب میں آ رہی ہوں بڑا آیا میرا چاچا ماما اسے اپنی بے بس کیفیت بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

”کچھ بچالالی ہو یا گنوا آئی ہو اپنا آپ؟“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بڑی جھپتی نظروں سے اسے ٹٹل رہا تھا۔ رائہ کی تھیلیوں میں پیسہ اتر آیا۔ وہ ہونٹ چباتے ہوئے سر تھکا کر انگلیاں مسل رہی تھی۔ چرو احساس شرمندگی سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہوا۔“ بہت طاقت لگا کر اس نے مضبوط اور ٹھوس لب و لہجہ اختیار کیا تھا۔

”نور! واقعہ بیان کرو۔“ اس کے چہرے سے سکون اور اطمینان جھلکنے لگا۔ رائہ نے مختصراً بتا دیا کہ موصوف کی جسارت پر اس نے کیا حکمت عملی اپنائی۔

”اس سے پہلے کہاں ملا تھا تم سے؟“ وہ کس دھڑلے سے اسے تم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ رائہ کو طیش تو آیا۔ مگر صبر کے گھونٹ بھر کر چپ رہی۔

”جس دن میری کمرشل ایریا میں ڈیوٹی تھی۔ اس

کے تیور مجھے اسی دن کھٹک گئے تھے اس لیے اس کی چکنی چھری باتوں میں آنے کے بجائے جان چھڑا کر آ گئی تھی۔“

”تمہیں سازش سے پھنسا یا گیا ہے۔ مگر کمال حماقت یہ ہے کہ تم ابھی تک سامنے کا بندہ نہیں دیکھ سکتیں!“

”کون لیاقت صاحب؟“ اسے خیال آیا۔

”نہیں وہ محض کانغہ کے شیر ہیں۔ پس یہ دوسرے لوگ ہیں۔“ اس نے ذہن نشین سے کام لیا۔

”دوسرے کون۔“ رائہ الجھ گئی پھر چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

”مگر آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا اور آپ ایف ایون کس طرح پہنچے۔“ سب سے پہلے پوچھے جانے والے سوال کا خیال اسے اب آیا تھا۔

”آپ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں تو آپ کو دوسرے بھی نظر آئیں ناں۔“ وہ طنزاً بولا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

اور پھر جب اس نے آفس کے عین سامنے پارکنگ لاٹ میں موٹر بائیک روکی تو اپنی گاڑی کی طرف بڑھتی ہوئی شانے انتظار رہے کے تحیر سے ان کی سمت دیکھا تھا۔ وہ اسے ڈراپ کر کے فوراً واپس ہو گیا۔

”یہ تمہیں کہاں مل گیا اور اس نے تمہیں اپنے ساتھ بٹھانا کیسے گوارا کر لیا۔“

شانے کے لہجے سے استعجاب ٹپک رہا تھا۔ رائہ کوئی بات نہ بتا پائی کیا بتائے اور کیا کہے۔ اس نے شانے کے تعجب پر دھیان نہیں دیا تھا وہ اس لوہڑ بن میں گئی ہوئی تھی کہ شا کو سارا واقعہ بتانا چاہیے یا نہیں۔

♥ ♥ ♥ ♥

دوسرے دن اس کی آف تھی۔ اس سے اگلے روز ڈیوٹی پر آئی تو اندر سے خوفزدہ ہی تھی۔ کسی انہونی کے ڈر سے ادھ موٹی ہوئی جا رہی تھی۔

”رائہ ادھر آؤ۔“ شانے کے یار نے پرہ متوحش سی اس کی ٹھیل کے پاس آکر رک گئی۔

”تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا پرسوں؟“ اس کا لہجہ

بے حد نرم تھا مگر نظریں گہرائی تک جانچنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

”سول؟“ اس کا سانس حلق میں اٹکنے لگا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے جلدی سے تھوک نگل کر کہا۔

”مگر فرمان صاحب کے ملازمین کا خیال کچھ اور ہے۔ ان کے مطابق تم نے کمپنی کے براؤنٹ متعارف کروانے کے بہانے گھر میں گھس کر فرمان صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا اور پھر انہیں زخمی حالت میں چھوڑ کر فرار ہو گئیں۔ گیٹ کا چوکیدار اور مالی گواہ ہیں اس واقعے کے۔ انہوں نے تمہیں آتے جاتے دیکھا تھا۔“

رائیہ کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

”یہ۔ یہ الزام ہے مس شا! اصل واقعہ کچھ اور ہے۔“

”میں وہی پوچھ رہی تھی۔“ شا کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ رائیہ نے ہانپتے کانپتے سارا احوال کہہ سنایا۔

”لیکن تمہاری بات کی سچائی پر کون یقین کرے گا۔ وہ فرمان صاحب تو تمہارے خلاف پرچہ کنوائے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ شا کا چہرہ گہبر ہو گیا۔

”کیا؟“ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ لاکھ ہمار اور بولڈ ہی تھی تو لڑکی۔ جسے غم روزگار کے ہاتھوں پہلی مرتبہ گھر سے باہر نکلنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ اپنی زمانہ شناس بہر حال نہ ہوئی تھی کہ شاطرانہ چالوں کو سمجھ سکتی۔

”تم چاہو تو ان سے مل کر معذرت کر کے معاملہ سنبھال سکتی ہو۔“ شا گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”وہ بہت غصے میں ہیں مگر تمہاری معذرت سے ہو سکتا ہے مان جائیں۔ مرد کو پٹانا کون سا مشکل ہوتا ہے۔“

”اکی ایم سوری میں ان کی خوشنودی کے لیے یہ سب نہیں کر سکتی۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔

”سوچ لو، معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔ وہ گھڑی کی چابی اور خوشامد عمر بھر کی بدنامی سے بہر حال کم

تکلیف دہ ہے۔“ اس نے جیسے منہ بچ سے ڈرایا۔ رائیہ گھصے میں پڑ گئی۔ نہ جانے رشتہ نہ پائے مانہ۔

”میں دوبارہ اس مکار بھڑیے کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“ وہ بے بسی سے گویا ہوئی۔

”تمہارا رویہ کمپنی کے سودے پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔ فرمان صاحب نے ہم سے ایک اہم ذیل کی ہے۔ تمہارے انکار کی صورت میں وہ کینسل ہو سکتی ہے۔“

”کچھ بھی ہو، میں دوبارہ اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔“ وہ دل ہی دل میں تہہ کر چکی تھی۔ ”اب تو قسمت سے بچ نکل بھی دوبارہ گئی تو شاید کبھی واپس نہ آ سکوں۔ اس سے تو بہتر ہے۔ میں ملازمت چھوڑ دوں پھر اس نے فیصلہ سنایا۔

”تمہاری کمپنی کا اصول ہے کہ جاب چھوڑنے سے پندرہ روز پہلے نوٹس دینا ہوتا ہے۔ تاکہ ہم بروقت متبادل کا انتظام کر سکیں۔“ جونہی اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ آگے سے شا کا کھڑا توڑ جواب اسے برف بنا گیا۔ گویا اب مزید پندرہ روز تک ڈیوٹی پر آنا تھا۔ تب ہی نجات مل سکتی تھی۔

”میں آج ہی نوٹس دے دیتی ہوں۔“

”تم نے اپنی حماقت سے فرمان صاحب سے بگاڑ پیدا کیا ہے۔ کمپنی کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہے اب یا تو تاج بھٹو یا پھر فرمان صاحب سے مل کر معاملے کو ہمیں ختم کروادو، مرضی ہے تمہاری۔“ شا کے اس طرح غیر جانبدار بن جانے پر اسے بہت دکھ ہوا۔ اس نے لفظی ہمدردی بھی نہیں جتائی تھی۔ اسے اس وقت ماں کی مہیاں آغوش کی طلب بری طرح ستا رہی تھیں۔

شا انٹرکام پر سر کی ہدایت سن رہی تھی۔

”طاہرہ اسفندیار صاحب سے کہو، میرے آفس میں بلا رہے ہیں۔“ اس نے فون رکھ کر ریک جھاڑی طاہرہ کو آواز لگائی۔

رائیہ مرے مرے قدموں سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ مناخ سوچوں کی آگ بگولہ ہوا تھا۔ کھس جاتی

کے شریک راز کردوں۔

اسی ٹانھے ایک صاحب تیز تیز قدموں سے ہال کمرے میں داخل ہوئے۔ رائیہ نے یونہی اپنی سی اس نگاہ ڈالی یہ دیکھنے کے لیے کہ آخر یہ اسفندیار صاحب کیا چیز ہیں جس کے اتنے جڑے ہیں۔

چوڑے شانے، لمبا قد، گندمی رنگت، گھڑی ٹاک، دراز سا سپاٹ موڈ اور وہ مالی گاؤں میں کتنی نادان ہوں۔ سامنے کی بات نہ جان پائی اسے اپنی حماقت پر جی بھر کر افسوس ہوا۔

وہ اپنی ڈیوٹی پر جانا تھا اور وہ سمجھتی رہی تھی کہ اس کا بیچا کر رہا ہے۔

اسی لیے تو وہ کمپنی کے لوگوں کو جانتا تھا۔ کمپنی کے مرکزی گیٹ سے کچھ آگے جا کر اس کا ہائیک بلڈنگ کے عقی گیٹ کی طرف مڑ جاتا تھا۔ وہ چونکہ بروڈکشن کے شعبے میں تھا اس لیے براہ راست سامنے کا اتفاق ہونا مشکل ہی تھا۔ دیوار کے اس پار کا منظر آج واضح ہوا تھا۔

تو یہ تھا اسفندیار مگر اس کی وہ براسرار باتیں، نسب بھی انداز، ڈانٹ ڈھٹ بلکہ جھڑکیاں۔ وہ کس مقصد کے تحت اس کی گہرائی کر رہا تھا۔ اس کے مفادات کا خیال رکھ رہا تھا۔ ایک گھر کھلی تو وہ سرک پڑ گئی۔

وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر اس کے کمرے میں داخل ہو کر اٹھا۔

”ایک منٹ اسفندیار۔“ پندرہ منٹ بعد وہ باہر آیا تو کاؤنٹر پر موجود شا نے مخاطب کیا۔

”یہ کچھ پیپر ہیں۔ ان کے حسابات کچھ گڑبڑ ہیں۔ تم چیک کرو ڈرا۔“ صاف لگ رہا تھا کہ محض روکنے کا بہانہ ہے۔

”کسی ملازم کے ہاتھ میرے کمرے میں بھجوا دیں۔“

میں دیکھ لوں گا۔“ وہ رکے بغیر آگے نکل گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہال سے باہر تھا۔ احساس تو ہیں سے وہ ایک دم سرخ ہو گئی۔

شاید ایک سوچہ رائیہ کی موجودگی بھی تھی۔ ”اب ایسی بھی کیا بے مولیٰ۔ بندے کو کچھ تو

خیال رکھنا چاہیے مینور۔“ رائیہ نے ہڈ مڑی سے سوچا تھا۔ اس کی ہڈ دریاں ٹٹا کے ساتھ تھیں۔

♥ ♥ ♥

”تی اہم بات تم آج بتا رہی ہو مجھے۔“ ایسی سنتے ہی دل تمام کر رہ گئی تھیں۔ انہیں اس بات کا قلق ہو رہا تھا کہ رائیہ نے شروع دن سے ہی سارے معاملے سے باخبر کیوں نہ کیا۔ اب پائی سرے مگر چکا تھا۔ اکیلی عورتیں سر پر کوئی چھت نہیں۔ معاشی و معاشرتی پوزیشن انتہائی کمزور ہے۔ ایسی صورت میں ایک پارسو اور طاقتور شخص کی دشمنی کسی بھی خطرناک نتیجے سے دوچار کر سکتی تھی۔ وہ بے حد پریشان ہو گئیں۔

تو مجھے تو اول روز سے کھنگ رہی تھی یہ تو کڑی۔ اخباروں میں پرکشش اشتہارات شائع کر کر نوجوان لڑکے لڑکیوں کو راتوں رات امیر بننے کے خواب دکھاتے ہیں اور پھر ان کی سادگی، ناواقفیت سے کھاتے ہیں۔ اگر اس طرح سیکڑی کے بل پر کوئی کار تک پہنچا جاسکتا تو آج کوئی مفلس اور فلاں نہ پھرتا اور پھر عزت و ایمان اور شرم و حیا کا سودا کر کے کچھ کمایا بھی تو کیا حاصل۔ ایسی کمالی سے تو بھوکا مرنا بہتر ہے۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ تمہیں ایسی جاب کی اجازت ہی نہیں دینی چاہیے تھی۔“ وہ کف افسوس مل رہی تھیں۔

”اس وقت صورت حال بھی تو ایسی تھی اور کوئی جاب جو نہیں مل رہی تھی۔“ اس نے افسردگی سے منہ لٹکالیا۔

”اب کیا ہو گا امی! میں جاب چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ کم از کم پندرہ دن لازمی جانا ہو گا۔ ورنہ کمپنی قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر میرے خلاف کیس کر سکتی ہے۔“ وہ ماں کے بانو سے لگ کر پوچھ رہی تھی۔

”میں اسفندیار بیٹے سے بات کر گئی ہوں۔ شاید وہ کوئی حل نکالے۔“

”لا حول و لا قوہ۔ اب کیا اپنے گھر کی بات غیروں سے ڈسکس کرتے پھر گئے؟“ وہ فوراً چرچا گیا ہو گئی اور پھر ان جیسے آدم بیزار اور لوہے کے دل والے

بندے کو ہم سے کیا سروکار۔ کیوں خواہ مخواہ انکار سن کر جی خراب کرنا چاہتی ہیں۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔ بات چیت میں روکھا پھیکا سہی دل کا بہت اچھا ہے۔ کتنا خیال رکھتا ہے میرا۔ جب تم نہیں ہوتی تو اکثر آتے جاتے تیل بجا کر دروازے پر کھڑے کھڑے میرا حال پوچھتا ہے۔ تاکید کرتا ہے کہ کوئی کام ہو تو ضرور بتائیے گا۔ پھر وہ ذمہ دار طبیعت کا سلجھا ہوا نوجوان ہے۔"

"نوجوان کتنا تو خیر صاف قسمت ہے ان پر۔ موصوف اپنے منہ سے اقرار کر چکے ہیں کہ تمیں برس کے ہو چکے ہیں۔"

"تمیں جاری ہوں اس کے پاس۔" امی نے غور کر اسے دیکھا۔

"تم نادان ہو۔ معاملے کی تہ تک نہیں جھانک سکتیں۔ میرا تو دل ڈوبا جا رہا ہے۔ بڑی نازک صورت حال ہے اور اگر فوری قدم نہ اٹھایا گیا تو خدا نخواستہ عمر بھر کی پوچھنے لگنے کا احتمال ہے۔ دروازہ بند کر لو تم۔"

♥ ♥ ♥ ♥

"یہ کیسے ہو سکتا ہے امی؟" ان کی تجویز سن کر اس نے طویل چٹ ماری تھی۔ "اب موصوف کے پاس مسئلہ حل کرانے کی تمیں یا میرا رشتہ طے کرنے۔" وہ ٹھپاں پیچ کر اپنا غصہ کنٹرول کر رہی تھی۔

"تم سنو تو سہی ہتھ سے کیوں اکھڑ رہی ہو ادھر آؤ یہاں بیٹھو میں تمہیں ساری بات بتاتی ہوں۔" انہوں نے زبردستی اسے اپنے بستر پر بٹھالیا پھر ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بتاتے لگیں۔

"تمیں نے اپنی بات بتائی تو اس نے بتایا کہ وہ کافی حد تک معاملے سے واقف ہے وہ اسی کمپنی میں کام کرتا ہے۔ یہ بات بھی اس کے علم میں تھی کہ فرمان اینڈ سنز کے ساتھ تمہارے پاس کی کوئی اہم ڈیل ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک خفیہ ڈیل بھی مشروط کی گئی تھی۔ چنانچہ پاس کے مشورہ طلب کرنے اور فرمان کے فون کرنے پر ثنائے تمہیں سوچی سمجھی اسکیم کے تحت فرمان کے علاقے میں مارکیٹنگ کے لیے بھیجا۔"

کسی طرح اسفند کو اس پلان کا علم ہو گیا تھا اسی لیے اس دن تمہاری تلاش میں ایف ایون کی طرف آیا تھا۔ اسفند کو یقین ہے کہ فرمان کی طرف سے زبردستی گھر میں گھس کر قاتلانہ حملہ کرنے کا گیس بھی تھا اور پاس کے مشورے سے تیار کیا گیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ تمہاری بیک پر کوئی نہیں ہے اس لیے ذرا دھمکا کر تمہیں اپنے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اسی کے پیش نظر اسفند نے تمہاری شادی کی تجویز پیش کی تھی۔ میں نے عذر پیش کیا کہ فی الحال اتنی جلدی رشتہ نہیں طے کیا جاسکتا۔"

"اور جواب میں موصوف نے اپنا پروڈل پیش کر دیا۔" رائے نے دانت پیش کر بات مکمل کی۔

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔" امی اس کے غیض و غضب پر جل کر پوچھنے لگیں۔

"اسے کہتے ہیں جان نہ پہچان اور بڑی خالہ سلام جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اس سے ٹاکرا ہوئے اور ہم بلا سوچے بچے رشتہ داری جوڑنے لگیں؟ حد ہو گئی امی! صرف ایک ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں کسی کو کیسے پرکھا جاسکتا ہے۔ خدا جانے وہ سچا ہے یا فراڈ کر رہا ہے۔ یونہی جھوٹی موٹی داستان سنا دی ہو اپنی بیٹی کی۔" وہ جلال کے عالم میں کمرے میں ٹھل رہی تھی۔

"تمیں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ تم ابھی کم عمر ہو۔" بچی ہو اپنا برا بھلا ماں سے زیادہ نہیں جان سکتیں۔ دنیا بے اعتبار سہی مگر آخر کسی پتہ تو بھروسہ کرتا ہے۔ اس کے بغیر گزارا بھی نہیں ہے۔

"مگر میں موصوف سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔" آئی ایم سوری۔ "اس کے صاف جواب پر ای چپ رہ گئیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اسے جواب دے دیتی ہوں۔ تم زبردستی تو نہیں کر سکتی اب۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

♥ ♥ ♥ ♥

"منورائے! تم کسی اچھے وکیل کو جانتی ہو؟" اس کے ڈیوٹی بھگتانے کی مدت میں ٹھن پانچ دن

باقی رہ گئے تھے۔ جب ثنائے ایک روز اچانک پوچھ لیا۔

"کیوں؟" وہ ڈر سی گئی تھی۔

"مگر جانتی ہو تو اس کا بندوبست کر لو۔ ابھی تمہارے آنے سے دس منٹ پہلے پولیس کے دو ایلکار آئے تھے ساتھ لباس۔ میں انہیں تمہاری تلاش ہے۔"

"کیا مطلب۔" اس کے دماغ پر جیسے کسی نے ہتھوڑا برسایا تھا۔

"ہاں فرمان صاحب تم پر کیس کر چکے ہیں۔ میڈیکل رپورٹ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ان پر پتیل کے بھاری بھرکم آلے سے وار کیا گیا اور پولیس گلڈ ان پر تمہاری انگلیوں کے نشانات بھی لے چکی ہے۔"

ثنائے کا لبہ جھٹلا رہا تھا اس حساب سے رائے کے اندر خوف سرایت کرنا جا رہا تھا۔

وہ جیسے تیسے کام پٹا کر شام کو گھر پہنچی تو ایک نئی قیامت اس کی کھٹک رہی۔

"ریو بی! ہم تو تباہ ہو گئے۔ آج وہ سپر کو پولیس آئی تھی یہاں تو اچھی طرح گھر کی تلاشی لے کر گئی ہے۔ وہ تو شکر ہوا جو دونوں یونیفارم میں نہیں تھے ورنہ سارا محلہ تماشادیکھتا۔" امی کی آواز کانپ رہی تھی۔ چوہ ہلکی کی طرح زور دے رہا تھا۔

"اب اور برپا دی کیا ہوگی۔ بس میں نے ٹھان لیا ہے۔ تمہیں میری قسم۔ اب تم کچھ نہیں بولوگی۔ میں آج ہی اسفند سے بات کرتی ہوں۔ کل تک تمہارا نکاح ہو جانا چاہیے۔ الباس اس کی بیوی کو اور ثنائے کو مدعو کر لیتے ہیں۔ بلڈنگ کے باقی لوگوں کے گھر مٹھائی بھجوا دیں گے تاکہ اطلاع بھی ہو جائے اور ان کا گلہ بھی جا مارے کہ شادی میں نہیں بلوایا۔"

"امی پلیز! ایسا کچھ نہ کریں۔ دیکھیں میری بات سنیں۔" اس نے انہیں روکنے کی جھیری کوشش کی۔

منورہ اپنے ارادے سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹیں۔

"اب میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی۔ پہلے بھی تمہاری ہان کر سیکڑا کیٹو کی جاب پر رضامندی ظاہر

کی تھی۔ اب بھگت لیا ہے اس کا نتیجہ۔"

وہ بے بسی سے سر ہنجی رہ گئی۔ ٹھرا منوں نے اپنی سی کر ڈالی۔

اگلے دن وہ وہ سپر کو چھٹی لے کر گھر واپس آئی تھی کہ امی نے سختی سے ہدایت کی تھی۔ شام تک نکاح ہو گیا۔ بے حد سادگی بلکہ اخرا تفری میں ہوا تھا۔ دنہائے کاروائی اہتمام بھی نہ ہو سکا۔

اتفاق سے امی نے عید کے لیے اس کا فیوژنی ہلکے سے دیکے کے کام والا سوٹ بنوا کے رکھا تھا۔ وہی پہنا دیا گیا۔ زیور کے وہ سیٹ امی نے شروع سے اس کے لیے سنبھال رکھے تھے۔ انہیں پہن لیا۔ مندی انہیں کا بھی وقت نہیں تھا۔ بس ہلکی سی لب اسٹک اور کاجل کی دھار آرائش کا کام دے رہی تھی۔

"انشاء اللہ دیکھے پر کمر نکالیں گے۔" امی مطمئن تھیں۔

"اسی اب اسی رہ جائیں گی۔" اسے یاد آ رہا تھا۔

روایتی اور امی نے اسے یاد آ رہا تھا۔

"اسی کہیں جئے آہ" وہ قدم کا دھمکا رہا تھا۔

انہوں نے بڑے حوصلے سے کام لیا تھا۔ شام کو اسفند کے کمرے میں بھول کے آئی تھیں۔

♥ ♥ ♥ ♥

"رو کیوں رہی ہو؟" کمرے میں آتے ہی موصوف نے پہلا سوال دیا تھا۔

"مگر اب روؤں بھی نہ اپنے برے نصیبوں پر اور پوچھ کیسے رہے ہیں۔ جیسے ڈانٹ رہے ہوں اب آ رہا ہے روٹا تو ہم کیا کریں۔" اس کی جان جل کر رہ گئی تھی۔

وہ بیڈ کے بجائے نیچے قالین پر بیٹھی تھی۔ سرالبتہ صبری سے نکایا ہوا تھا۔

اسفند یار اطمینان سے اپنے جوتے اور جرابیں اتار رہا تھا۔ پھر الماری کھول کر کپڑے نکالے اور ہاتھ روم میں گھس گیا۔ واپس آیا تو کمرے آرام و شلواری قمیص میں تھا۔ وہ اسی طرح بیٹھی تھی البتہ زیور آتے ہی اتار کر ڈرنگ ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا تھا بلکہ ٹشو سے لب اسٹک بھی رگڑ کر اتار دی تھی۔ کپڑے اس

لیے نہیں بدلے کہ خاصے آرام دہ تھے اور اس کے پاس دوسرے تھے بھی نہیں۔

”کیا مسئلہ ہے۔ لڑائی وغیرہ کاموڈ ہے کیا۔“ وہ اس کی طرف آتے ہوئے بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا اور اگلے سے اس کے بندے کے سر کے بالوں کو چھوا۔ وہ سرک کر آگے ہو گئی۔ ادیبا کی خوشبو نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ وہ غور سے اس کے چہرے کے تاثرات پر دیکھ رہا تھا۔ رائے کے رد عمل نے اس کے دلی جذبات کی عکاسی کر دی تھی۔ وہ اس کی موجودہ حیثیت قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔

”آئی نے بتایا تھا کہ تم مجھ سے شادی پر رضامند نہیں ہو مگر یہ سہرا ان کی مجبوری تھی اور۔“

”کیا مجبوری تھی؟“ اس نے پھر اے ہوئے لیے

میں بات کالی۔ اور اگر تھی بھی تو بھی تو اس حکمت عملی سے کیا فائدہ ہوا۔“

”وہ تم خود دیکھ لو گی عقرب۔“ اس کے لیے میں استہکام تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر دراز ہو گیا تھا۔

”اور آپ نے ہماری مجبوری کا سودا کیا ہے۔“

اسے رتی برابر اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بلکہ گھرا ہوا گیا۔

”نہادان ہی نہیں کم نظر بھی ہو۔“ اس نے افسوس ظاہر کیا۔

”سہرا حال تم اپنے چھوٹے سے دماغ پر زور نہ ڈالو۔ چلو سو جاؤ پھر بات ہو گی۔“ وہ اچانک ہی کمرے سے نکل گیا تھا۔ اگلی صبح اسے پتا چلا موصوف ڈرائنگ روم میں سوئے تھے۔ رائے کو سرے سے نیند آئی ہی نہیں تھی۔ سب بار بار دل بھر آتا رہا۔

صبح کما تھا نشاء نے۔ پتھر بے بالکل پتھر اتار ف سا۔ اس نے بسور کر سوجا تھا۔ اس کی سیٹ دیوار جیسے مشینی بندے کے ساتھ زندگی کتنی پور گزر رہی تھی۔

ناشتہ ای بڑے چاؤ سے بنا کر لائی تھیں۔ انہوں نے بیٹی اور داماد کو خوب خوب پیار کیا تھا مگر رائے کاموڈ درست نہ ہوا۔ اسے دونوں پر وہ نہ کر غصہ آ رہا تھا۔ ناشتہ کے بعد وہ طوعاً و کرہاً اسفندیار کے ساتھ آفس جانے کے لیے نیچے آئی تو اس کی ہونڈا کی جگہ

نیا سونو کی کار کھڑی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پھر یاد آیا وہ گزشتہ ایک ہفتے سے اس کار کو یہاں دیکھ رہی تھی۔ گویا موصوف موٹر سائیکل بیچ کر کار خرید چکے ہیں۔ وہ سوچتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ادیبا کی خوشبو نے یہاں بھی پہنچا نہیں چھوڑا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر اس کے اتنا قریب جو بیٹھی تھی۔

خاصی ترنگ میں تھے صاحب اور تو اور ڈرائیونگ کرتے ہوئے کچھ گنگنا بھی رہتے تھے۔

”یونہی میرا دل جلانے کے حربے ہیں۔“ وہ تپ کر رہ گئی تھی۔

اسے اس کے ساتھ آتے بہت سارے لوگوں نے دیکھا تھا حتیٰ کہ شائے بھی مگر اسفندیار کو جیسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ بلکہ اسے ہال کمرے میں خود پہنچا کر گیا تھا۔

”یہ میرے کمرے کا فون نمبر ہے۔ کوئی مسئلہ ہو تو فوراً“ ترنگ کر دینا میں شام کو نہیں یک کر لوں گا۔“

اس کے بعد وہ چابی جھلاتا ہوا ہر نکل گیا تھا۔ ناشتہ شدہ کی دیکھتی رہ گئی۔

کیا نہ کسی طرح دو روز بیت ہی گئے۔ اگلے دن اسے اسفندیار سے اس آخری صبح کپڑوں کے آفس میں داخل ہوتے ہوئے مکمل طور پر مطمئن تھی مگر اس سے پہلے کہ شاکو اپنا اسٹیفنڈی دہاں ساتھ لباس میں پولیس کے دہاں کار اس کے منتظر بیٹھے تھے۔

”ہم آپ کو پوچھ کچھ کی غرض سے تھانے لے جانے آئے ہیں مگر!“ رائے کے قدموں تلے سے زین سرک گئی۔

”ہم۔ مگر کس سلسلے میں۔“ اس کی رنگت پہلی پڑ گئی۔ اس نے امداد طلب نظروں سے شاکی طرف دیکھا اس نے کندھے اچکاتے ہوئے فائل میں سر دے لیا۔

”ایک منٹ۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں کسی قسم کی کارروائی سے باز رکھنے کی تلقین کی اور پھر کانپتے ہوئے اسفندیار کے کمرے کے نمبر ڈال کیے۔

”اسفندیار! آپ ہال میں آجائیے۔“ اس نے اتنا کہ

کرفون رکھ دیا۔

”اسفندیار کیا لگتا ہے جسے مدد کے لیے پکار رہی ہو۔“ شائے معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

”اس کا جواب وہ خود دیں گے۔“ رائے نے سیٹ لیج میں کہا اور شاکو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ سیدھا اس کی ٹیبل کے پاس آیا تھا جہاں وہ ساتھ لباس والے کھڑے تھے۔

”جی کیا مسئلہ ہے؟“ اس کا انداز دو ٹوک اور قطعی تھا۔

”ہم انہیں ایک کیس کے سلسلے میں اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے جانے آئے ہیں؟“ ایک سپاہی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”پولیس اسٹیشن یا فرمان صاحب کے بیٹھے ہیں۔“ اس کا چہرہ ہوا درشت لب و لہجہ اہلکاروں کے ساتھ ساتھ شاکو بھی چونکا گیا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ دونوں اہلکاروں کے چہرے گھبراہٹ سے تر ہو گئے۔

”مطلب بھی سمجھا دیں گے۔ کیا آپ مجھے اپنے کاغذات دکھانا پسند کریں گے؟“ اس کا لہجہ پر سکون تھا۔

”کیسے کاغذات؟“ ایک نے اکھڑے ہوئے انداز میں رعب جمانے کی کوشش کی مگر اس کا چہرہ بے اعتمادی کا اشتہار بنا ہوا تھا۔

”جس کی بنا پر آپ کو پولیس اہلکار سمجھا جاسکے۔“ اسفندیار انتہا درجے کے سیلف کنٹرول سے کام لے رہا تھا۔

”تو کیا آپ کے خیال میں ہم جعلی پولیس والے ہیں۔“ ایک نے تڑی لگائی۔

”صرف خیال ہی نہیں مجھے یقین بھی ہے۔ البتہ آپ کی یقین دہانی کے لیے میں تجسّیٹ نیاز فاروقی سے یہاں آنے کی درخواست کر سکتا ہوں۔ میں سارا معاملہ ان کے گوش گزار کر چکا ہوں کہ وہ جعلی پولیس والے ایک شریف لڑکی اور اس کے گھروالوں کو اپنے پاس فرمان صاحب کی ہدایت پر تنگ کر رہے ہیں اور ڈرا دھمکا کر اسے اغوا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ رہا

قائدانہ حملے کا کیس تو اپنے پاس سے کتنا اہمیت ہے تو“

”جج جج پرچہ درج کروادیں۔ وہ جانتے ہیں کہ عدالت میں کیس چلے گا تو الٹا ان کی گردن پھینے گی۔ لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کے جرم میں عدالت انہیں سزا سناسکتی ہے۔ ایسے کیسز میں چونکہ خاتون کو اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے جوابی اقدام کرنے پر سزا نہیں ہوتی“ اس لیے وہ صاف بیچ جائے گی۔ میں فرمان صاحب سے بڑا وکیل کر سکتا ہوں۔“

وہ بہت برا اعتماد بے خطر اور بار عجب لگ رہا تھا۔ وہ درحقیقت ان کرائے کے غنڈوں سے زیادہ شاکو سنا رہا تھا۔ جانتا تھا اس کے ذریعے یہاں کی کارروائی حرف بحرف فرمان صاحب تک پہنچ جائے گی۔

”مگر آپ اس خاتون کے کیا لگتے ہیں۔“ ایک جعلی پولیس نے پوچھا۔ اس کے غبارے سے ہوا نکل چکی تھی۔ اب وہ شرافت سے سر جھکائے کھڑے تھے۔

”میں اس کا شوہر ہوں۔ کیا نکاح نامہ دکھاؤں۔“ اس نے جیب سے کاغذات نکالتے ہوئے اطمینان سے دریافت کیا۔ وہ ہونٹوں سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ مگر شاکو جج جج کی گریڑی تھی۔

”تم نے اس سے شادی کب کی؟“ اس کی آواز جیسے کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی اسے ایک قابل توجہ نظر کے لیے ترسانے والا مرد اتنی آسانی سے رائے جیسی سیدھی سادی لڑکی کے آگے ہتھیار پھینک دے گا۔

”آپ تارن پڑھ سکتی ہیں۔ ویسے چاروں گزر چکے ہیں۔“ اس نے نکاح نامہ شاکو کی ٹیبل پر رکھ دیا۔ جسے بغور ملاحظہ کرتے ہوئے اس کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ بے شک اس نے اسے پانے کے خواب نہیں دیکھے تھے مگر اتنا تو یقین تھا کہ میرا نہیں ہے تو کیا ہوا کسی اور کا بھی تو نہیں ہے۔ اب یہ خوش فہمی بھی دم توڑ گئی تھی۔

”ویسے میں دادوں گا آپ کی پاس کی اور فرمان صاحب کی مشترکہ پلاننگ کو۔ اتنی خوب صورتی سے اس کے گرد جال بچھایا تھا کہ اگر خدا کی کرم نوازی نہ

ہوتی تو رائے کبھی نہ بچ سکتی۔ پہلے فرمان صاحب کے گھر بھجوا کر اور پھر جعلی پولیس والوں کا ڈرامہ رچا کر۔ خیر ایک لحاظ سے تو میرے ساتھ نیکی ہی کی۔ اس ڈرامے کے باعث مجھے مشقت میں پڑے بغیر زندگی بھر کی خوشی ملی گئی۔ ورنہ دل کی بات زبان پر لانے میں میں گزر جائیں۔ اپنے فرمان صاحب سے کہہ دیجئے گا۔ اب رائے کی طرف اگلا قدم یہ سوچ کر رکھائیے گا کہ وہ کمپنی کی معمولی سیلر ایگزیکٹو نہیں میری بیوی ہے۔

وہ بزدل چوسے واپس جا چکے تھے۔ لمحوں میں صورت حال بدل چکی تھی۔ اسفندیار کو باس کا انتظار تھا۔ ان کے آتے ہی اپنا اور رائے کا استغنیٰ انہیں تھا دیا۔ جب رائے سے اپنے تعلق کا ذکر کیا تو باس صاحب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

”سر! قاعدے کے مطابق ہم دونوں پندرہ دن پہلے نوٹس دے چکے ہیں، لہذا اب ہمیں اجازت دیجیے۔“

”مگر تم میری کمپنی کیوں چھوڑنا چاہتے ہو۔ کوئی شکایت ہے تو مجھے بتاؤ اگر رائے کے سلسلے میں خفگی ہے تو میں ابھی فرمان سے بات کر کے معاملہ پنہاں کر دوں گا۔“

”زبان پر تو اب وہ واقعی نہیں لائیں گے۔ میں جسٹس نیاز فاروقی کے ذریعے انہیں نوٹس بھجوا چکا ہوں۔ آپ کے ساتھ کام کرنے سے معذرت خواہ ہوں کہ میں اپنی ذاتی کمپنی کھول رہا ہوں۔ آفس سیٹ ہو چکا ہے۔ اب کام شروع کرنے کی دیر ہے بس۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی آفیشل آپ سے ملاقات رہے۔ بہر حال اجازت دیجیے گا۔ اور رائے۔“

کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ نشانے دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اسفندیار نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

”یہ مضبوط قلعہ تمہارے ہاتھوں میں خیر ہونا تھا سو ہو گیا۔“

”جی فرمان صاحب۔“

اسلام آباد کا موسم بڑا منچلا ہے۔ صبح اچھی خاصی دھوپ تھی مگر اب دو گھنٹے بعد جب وہ لوٹ رہے تھے تو ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔ شفاف سرخس دھل کر چمک رہی تھیں۔ مارگلہ کے بلند و بالا پہاڑ بھی یہ خوشگوار بوند باندی انجوائے کر رہے تھے۔ ان کی گہری

بز چوٹیاں بادلوں کی اوٹ میں سیاہی مائل لگ رہی تھیں۔ ٹریفک کا رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے اسفندیار بڑے ریلیکس موڈ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر فرنٹ سیٹ پر بیٹھی سبز سوئی شلوار لہیں اور سرخ دوپٹے میں ملبوس رائے گردن موڑے موسم کی خوب صورتیاں نظروں میں جذب کر رہی تھیں۔

اسفندیار گاہے بگاہے اس پر نگاہ ڈال کر اس کی محویت ملاحظہ کر رہا تھا۔ وہ بظاہر موسم کی سرمستی دیکھ رہی تھی مگر درحقیقت سوچوں کی اٹھاہ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے حواس ابھی تک منتشر تھے۔ شاہ اور باس کی ملی بھگت نے اسے کس درجہ اذیت پہنچائی تھی۔

”آج سے آٹھ سال پہلے جب میں نے یہ کمپنی جوائن کی تھی۔“

”جی۔“

”کمال حماقت یہ ہے کہ تم ابھی تک سامنے کا بندہ نہیں دیکھ سکیں۔“

23

رائے کو لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکنیں رک جائیں گی۔ یا خدا پرست در پرست ملے جیتے ہوک صد شکر کہ میں اس چشم سے تجھ پر دلیں لوٹ آئی ہوں۔

”اور اس کا شوہر کیا وہ نہیں جانتا کہ شاہ اور باس۔“ اس سے آگے اس کی زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ اس کا سر بے اختیار جھک گیا تھا۔ عورت کا یہ کون سا روپ تھا۔ ایک بیوی، ایک ماں ہوتے ہوئے عصمت و عفت کے ہر تصور سے کوسوں دور تھی! جب ہی تو شاہ نے رائے کو ہدایت کی تھی کہ شرم و حیا اور جھجک سے کام نہیں لینا چاہیے۔

اور عیش پرست عروں کی کی نہیں رہی ہے۔ جب شاہ نے جب شروع نہیں کی تھی تو وہ ایک معمولی سے کوارٹر میں رہتے تھے اور شاید تا عمر اسی تنگ و تاریک جگہ پر گزار بسر ہوتی اگر شاہ جاب کے بعد باس کی مہمانوں کی بارش میں نہ بھیجی۔ اس کا خاوند جانتا ہے کہ ہنگہ کار بیش قیمت ساز و سامان بچوں کا انگلش میڈیم اسکول میں داخلہ اور گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کھلی رقم اس کی بیوی نے باس کو اپنے حسن کا ذرائع دے کر حاصل کی ہے اور اگر اس نے روایتی غیرت دکھانے کی کوشش کی تو سب کچھ بھن جائے گا۔ سو وہ جان بوجھ کر کانوں میں روٹی لپیٹے یہ سب نظر انداز کیے ہوئے ہے۔ ”اسی میں اس کی عافیت ہے۔“

”اف خدایا۔“ اخلاقیات کا یہ حشر دیکھ کر وہ کانپ کر رہ گئی تھی۔ ماریت پرستی نے جس طرح اعلیٰ اقدار کی جڑیں کھوکھلی کر ڈالی ہیں اور نکالیا اسے کھن نہیں آئی خود سے، باس سے اور اپنے بے غیرت خاوند سے۔ اس نے بے اختیار جھڑپ ماری لی تھی۔

”اور ایک بات شاہ باس سے بھی چھپائے ہوئے ہے کہ وہ بھی کبھی کبھار باس سے بھی بے وفائی کر گزرتی ہے۔ بشرطیکہ بندہ اس کے اوئے معیار پر پورا اترتا ہو۔“ اسفندیار نے اپنے انکشاف کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔

ہاں اس بات کی تو وہ خود گواہ تھی۔ کس طرح یاد کو ہلانے ہلانے سے بلا کر روک کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ طاہرہ خالہ نے کہا تھا۔

”ارے بی بی! اس عورت کا کس کے ساتھ چکر نہیں ہے۔ طبیعت ہی ماشاء اللہ ایسی پائی ہے۔“ ایک وی اس کی گھٹاؤنی شخصیت کے تاریک پہلوؤں سے بے خبر رہی تھی۔

اس نے جوری سے اسفندیار کی طرف دیکھا۔ اس کی طرف کی کھڑکی کا پورا شیشہ نیچے تھا۔ اس لیے سرد ہوا براہ راست اس سے ٹکراتی تھی۔ جس نے اس کے گندمی رخساروں پر سرخی کی مچھرا دی تھی۔ اس کے چاکلشی بال قدر سے بے ترتیب ہو کر پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ سیاہ جینز اور لائٹ پنک شرٹ میں اس کا لائبریریا ہمیشہ سے زیادہ سوراخ اور پروکار نظر آ رہا تھا۔ واقعی کچھ تو تھا اس میں کہ اس کے روئے کچھ پچھلے طرز عمل کے باوجود شاہ نے قدم نہ روک سائی تھی۔

اسی لمحے اسفندیار نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ نظریں ملنے پر وہ خفیف سا مسکرایا۔ رائے نے گھبرا کر دوبارہ کھڑکی کی طرف رخ موڑ لیا۔ اس کی مسکراہٹ میں جو کچھ تھا وہ اسے سمجھتا نہیں چاہتی تھی۔ شادی کو چار روز ہو چکے تھے مگر دونوں کے درمیان وہی اجنبیت دوری اور تکلف تھا جو بیٹھ سے رہا تھا۔ وہ بیڈ روم میں سوئی تھی اور اسفندیار ڈرائنگ روم میں۔ جیسے ایک خاموش معاہدہ ہو گیا تھا۔ دونوں کمپنی کے لیے اکٹھے نکلتے تھے۔ کھانا ایک ساتھ کھاتے تھے اور بس۔ آپس میں گفتگو یا تعلق رائے نام ہی رہا تھا۔ اتنے دن کے بعد آج ان میں تفصیلی گفتگو ہوئی تھی اور وہ بھی شاہ کے حوالے سے۔ اب پھر خاموشی تھی۔

اور وہی خاموشی ان کا حال دل سناری تھی۔ ایک کہنا چاہتا تھا۔ ”سی ڈی پر عمر گزار دو اب یہاں سے کہیں نہ جانا۔“ دوسرا لیکن وہاں چاہتا تھا۔ ”مجھے اعتبار دلاؤ کہ تمہاری پناہ میں جبر نہیں محبت کی گری ہے۔ تم ساری عمر مجھے پھولوں کی طرح رکھو گے۔ سخت لہجوں اور سرد سپاٹ دیووں سے میرا روپ نہیں

کہتاؤ گے۔ مجھے رکھائی اور آدم ہزاری کی مار نہیں مارو گے۔ مجھ سے محبت کرو گے صرف میرے لیے۔ گزارے کے لیے نہیں۔

”ارے امی! آپ بارش میں سڑک پر گھوم رہی ہیں۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔“ بلڈنگ کے قریب آتے ہی امی کو بھیگی سڑک پر ہلکی ہلکی ہوا میں چہل قدمی کر کے دیکھ کر وہ کھڑکی سے پیچنی گئی۔ اسفندیار نے امی کے قریب گاڑی روک دی تھی۔

”میں بہت مزے میں ہوں بیٹے۔ میری فکر نہ کرو۔ ایک عمر کے بعد اتنا سکون اترا ہے دل میں اور یہ ہوا تو بہت مہربان لگ رہی ہے۔“

امی کے چہرے پر بچوں کی سی مسکراہٹ اور سکون رقم تھا۔

”تم بتاؤ۔ آج ہو گئے ان زنجیروں سے آزاد۔“ ان کا چہرہ جھک رہا تھا۔

”جی ہاں امی جان۔“ اسفندیار نے جی جان سے انہیں مخاطب کیا تھا۔ امی نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

”اچھا چل کر آرام کرو۔ کب کی جان سولی پہ لٹکی ہوئی تھی۔ آج اللہ نے اپنا کرم کیا ہے۔“ وہ پیار سے مخاطب ہوئیں۔ وہ انہیں ماحول سے لطف اندوز ہوتا چھوڑ کر بیڑھیاں ملے کرتے ہوئے اوپر آ گئے۔ پانچویں فلور پر اپنے فلیٹ کے سامنے رائے کے قدم است ہوئے تو اسفندیار نے نرمی سے ہاند تھام لیا۔

”اونٹنوں آپ کی منزل یہاں نہیں اور ہے۔“ وہ اسے اپنے فلیٹ میں لے آیا بیڈ روم میں داخل ہوئے ہی رائے قہقہے سے بازو پر رکھا اس کا ہاتھ الگ کرتے ہوئے کھڑکی کے رخ پر سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ اس سے ٹھنڈی نم ہوا براہ راست اندر آرہی تھی۔ وہ پھر کے گیارہ بجتے والے تھے مگر اب رات کو مطلع نے فضا کو ٹھنڈا سا خوابناک لہارہ اوڑھا دیا تھا۔

”تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی تھیں رائے۔“ وہ کھڑکی کے پاس دیوار سے پشت ٹکا کے دونوں ہاند سینے پر لپیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ لہجہ خاصا نرم

تھا۔ ”میں آپ کو پسند نہیں کرتی تھی۔“ اس نے ساگی سے جواب دیا۔

”وہ کیوں؟ میرا مطلب ہے کوئی خاص وجہ؟“ وہ بغور اس کی موٹی موٹی چمکدار آنکھوں، عنابی بھرے بھرے لبوں اور سلکی دراز بالوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے نقوش کی جانیت میں بے خبری کے رنگوں نے عجب مقناطیسییت بھری تھی۔

”آپ کی بد مزاجی اور سخت رویے کی وجہ سے۔“ آپ بہت مددھے پچھلے اور ”استاد ٹاپ“ شخص ہیں۔ جھڑپنے اور نفیست کرنے کے علاوہ کچھ آتا ہی نہیں۔“ اسفندیار کو ہنسی۔ تو بہت آئی مگر وہ بند کرتے ہوئے اپنی مسکراہٹ دبا گیا مبادا اس کا سوڈا بڑ جائے۔

”تم نے موقع ہی کب دیا ورنہ اور بھی بہت کچھ دکھا دیتے اور تم سے کس نے کہا کہ میں روکھا بیٹکا انسان ہوں۔ ہاں۔ ضرور ہے کہ ہر کسی کو لفت نہیں کراتا۔ نہ ہر لڑکی کو خود سے فری ہونے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ میری محبت، ہنسی، خوشی، مسکراہٹ اور لطیف جذلوں پر صرف اس کا حق ہے جسے دل میں اور گھر میں پسایا ہے اور جو تا عمر یہیں رہے گی اور میں بد مزاج بھی ہرگز نہیں ہوں۔ بس اتنا ہے کہ شروع سے اکیلا رہا ہوں اور اکیلا شخص یا تو دیواروں سے بات کر سکتا ہے یا تصویر آتی محبوب سے اور لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں۔ اس لیے میں نے ایسا نہیں کیا۔ اب تم میری زندگی میں آ گئی ہو تو دیکھنا سارا چڑچڑاہن اور آہم بیزاری اڑ چھو ہو جائے گی اور کچھ؟“

رائے نے دیکھا وہ مسکرا رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں نرم نرم سی جھجک تھی۔ پھر وہ کھڑکی چھوڑ کر اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا اور پچھلے سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

”آپ جن بھوت کی طرح میرے پیچھے کیوں پڑے تھے اور ہر جگہ میری حفاظت کو کیسے پہنچ جاتے تھے۔ آپ نے میری اتنی مدد کیوں کی؟“ سوال پوچھنے کا انداز ایسا تھا گویا یہ بھی جرم میں شامل ہے۔ اسفندیار کو بے

اختیار بخشی آنے لگی۔ وہ کسی سچے کی طرح منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

”کیونکہ یہ دل کا معاملہ تھا۔ بس یا کچھ اور۔“ وہ بڑے خوب صورت انداز میں مسکراتے ہوئے جھکا۔

”یار! اور کتنا نام لوگی راضی بنائے میں۔ دیکھو میں روز روز ڈرائنگ روم کے صوفے پر سکرسمٹ کر نہیں سو سکتا۔ یوں بھی کل سے اسی جان آجائیں گی یہاں۔ وہ ہمارے آپس کے خوشگوار تعلقات کی براہ راست جھلک ملاحظہ کریں گی تو ان کی ایک مدت بعد سنبھلی ہوئی طبیعت پھر بگڑ جائے گی۔ کچھ تو خیال کرو۔“

”وہ کیوں آئیں گی یہاں۔“ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔

”تو کیا انہیں اکیلا چھوڑ دیں گے۔“ وہ سخت خفا ہوا اور ڈانٹ کر کہنے لگا۔

”پر سول پہلی تاریخ ہے۔ مالک مکان کرایہ لینے آئے گا تو اسے فلیٹ کی چابی پکڑا دیں گے۔ جب بیٹے کا گھر موجود ہے تو کرائے کے فلیٹ میں کیوں رہیں۔ یہ تو شادی کی بات کے ساتھ ہی ملے ہو چکا تھا۔ میری طرف سے یہی شرط ٹھہری تھی۔ انہیں سہرحال مانتی پڑی۔ تم نے بہت باز آؤ اس لیے ان سے۔ اب میری باری ہے۔“

رائہ کا دل خوشی سے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھرتی جا رہی تھیں۔ یہی تو واحد پھالس تھی جو ابھی تک دل سے نہیں نکل پائی تھی۔ بیمار ماں کو تنہا فلیٹ میں چھوڑنے کے خیال سے جیسے کوئی دل کٹھنی میں بھیج لیتا تھا۔

”ساتھ والے کمرے میں ایک سنبھل بیڈ، دو کرسیاں اور میز موجود ہے کتابوں سے بھری ایک لکڑی کی الماری ہے۔ اس کمرے کو میں نے اسٹڈی روم بنایا ہوا تھا جب مطالعے کا موڈ ہوتا تو رات کو ادھر ہی پڑھتا پڑھتا سو جاتا۔ میں شام تک کتابوں کی الماری بیڈ روم میں سیٹ کر دوں گا تاکہ اسی جان اپنی دیگر چیزیں وہاں ایڈجسٹ کر سکیں اور ہاں اب تم سلیقہ مند بیویوں کی طرح کچن سنبھال لو۔ یہ اطلاع مل

چکی ہے کہ کھانا پکانے میں خاصی مٹی گزری ہے۔“ لے شروع کی غلطیاں معاف۔ لیکن دو ماہ کے پیڑ کے بعد سخت چکنگ ہوا کرے گی۔“ اس رائہ کے بالوں سے ٹپکتے ہوئے اسے ڈرایا۔

”آپ تو خود اتنا اچھا کھانا پکا کر لیتے ہیں۔“ اس بھولا سا منہ بتایا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا یعنی شادی کے بعد بھی میں خود پکائوں گا۔“ اس نے مصنوعی تحیر سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”کیا حرج ہے۔“ اس کی سادگی و معصومیت قابل دید تھی۔ ”ہیوں بھی میرے ساتھ کام میں ہاتھ توٹائیں گے ہاں۔“

”منظور ہے۔ مگر سوچ لو۔ لڑائی بہت ہوا کرے گی۔ کیونکہ آپ بھی کچھ کم ضدی اور جھگڑالو واقعی نہیں ہو میں۔ میں اپنی ترکیب بتاؤں گا اور آپ اپنے طریقے پر ڈلی رہیں گی۔“

وہ اسے بازوؤں میں سمیٹ کر مسرور کن انداز میں اطلاع دے رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جسے آدم ہزاری اور سخت دلی کا ناسل دیا گیا تھا۔ جس کے لیے ہنسنا مسکراتا منع تھا۔ آج وہ اتنے نرم گرم پیار بھرے گفتگو انداز میں بات کر رہا تھا۔ اسے ہنسنا تھا۔ اعتبار اور پیار کی مہریں ثبت کر کے اپنے اندر چھپی محبت کا اظہار کر رہا تھا اور رائہ کو زندگی ایک نیا سبق پر محاربی تھی کہ ہر مو کے اندر ایک نرم و لطیف مرد چھپا ہوتا ہے بشرطیکہ کھوجنے والا صحیح پہلو پر دستک دے۔ یہ رکھائی و ہزاری اور فحشہ و غضب تو دیواریں ہوتی ہیں اپنے اندر کی محرومی کو دوسروں کی نظر سے بچانے کے لیے دیوار کے اس پار اک موم کا پتلا ازل سے اپنے من پسند فنکار کا خطر رہا ہے اور وہ جانتی تھی اس کی خوش باش رفاقت اسفندیار کی زندگی کی ہر محرومی کا ازالہ کر دے گی۔ اب اسے کسی دیوار کی ضرورت نہیں رہے گی کہ اب ہر منظر صاف شفاف اور واضح ہو گیا تھا۔





”نیرا“ کہہ کر وہ اپنی بات کو قوی سمجھاواست میری بات تو ہے براہ راست ہی نہیں ہوتی۔ ”نصیرہ“ پاپا سے کہہ کر چلے گئے تھے دیکھ کر پاپا۔
 ”یہ ہو یا بھی“ ”نیرا ہاتھ میں پکڑی حلوہ کی پٹ پٹ چوڑی چھتی ربیعہ کو تھما کر نصیرہ آپا کے قریب کھت پر بیٹھی۔

”وہی پرانا قصہ ہے بھابی!“ ربیعہ بیزاری سے

ہون۔

”لڑکی جان یہ ہوئی گویا جرم عظیم کر ڈالا اس نے۔ ٹھٹھ بیٹھے سوئے جانے“ آپ جانے پر پابندی پہننے کے لئے پروڈانٹ پھنکار کاہ کرو تو سٹھ نکال نکال کے جی جا رہا ورنہ کہ تو بد حرامی کے طعنہ دے دے کر انہی کی مریض بناؤ الالہ۔“

”ہٹو! تمہیں تو آپا نے چھوڑوں کی طرف رہا ہوا ہے اصل بات یہ۔“

”اصل یہ تو عقل یا سوہتوں کی ایک بات۔ مرغی کی دہائی ایک لاکھ ہے کہ ہاں کروں ان کی عزیز خالہ کے لئے ان کے عزیز ترین بیٹے کے لیے۔“ ربیعہ نے برا

کہا تھا۔

”ہاں تو حسن ہی کیا ہے بھئی۔“ ”نیرا“ نصیرہ پاپا کا

ہاتھ دیا۔

”مری“ ”نیرا“ اپنے دیکھ بھالے جانے پہچانے رشتہ اتنے ہوتے ہیں یا جن اور بیگانے دونوں سے شہداری راس کی ہے۔ ”نصیرہ“ پاپا نے تائید چاہی۔
 ”اے دیکھ حال“ ”اے قاتل“ ”اے دار اور جہاں“
 ”اے دیکھ حال“ ”اے قاتل“ ”اے دار اور جہاں“

”نیرا“ کہہ کر وہ اپنی بات کو قوی سمجھاواست میری بات تو ہے براہ راست ہی نہیں ہوتی۔ ”نصیرہ“ پاپا سے کہہ کر چلے گئے تھے دیکھ کر پاپا۔
 ”یہ ہو یا بھی“ ”نیرا ہاتھ میں پکڑی حلوہ کی پٹ پٹ چوڑی چھتی ربیعہ کو تھما کر نصیرہ آپا کے قریب کھت پر بیٹھی۔
 ”وہی پرانا قصہ ہے بھابی!“ ربیعہ بیزاری سے ہون۔

ذات میں ڈھیروں ڈھیروں اسراریت لئے ہوئے کھل کے ہی نہیں دیتا۔ میری مشق تو اس کے ساتھ ہے آپا۔ ”نیرا“ نصیرہ نے اس کے ساتھ ساتھ ”نیرا پاپا“ تو آخری لمحوں تک مجھے سمجھاتا رہا اس بڑے میں زندگی گزارنے کے صحیح اور بے غم نہیں آتے۔ مرنے کے ساتھ خوش نہیں ہو سکتا۔ اچھی تو بھائیوں کے سر پر ہے اس کے بے غم فراغت کے مزے دے رہا ہے کل کو اپنے ہاتھ بوجھ آیا تو ڈھونڈ نہ جائے گا سودی ہو گا شہر۔ بعد بھائیوں نے اس کے حصے کی ایک دکان میں سپرد کر کے کاروبار آگ کر دیا۔ بانی گھر بننے کے لئے تقسیم کر کے چاہو تو اس سے اپنا حصہ لے لے کر چاہو تو کرائے کا مکان لے کر باقی رقم بینک میں بانی دونوں بھائیوں نے تو عقل مندی کا نام ہوئے وہی رقم کاروبار میں لگا کر ایک شاپنگ ڈسپارٹمنٹ اسٹور بنالیا اور ان صاحبان نے اپنی ایک الین جیسے پوش سکیٹ میں بیٹھ کر رہا ہے۔

ایسے پریشانہ کمرے کے ایک ہال کے اندر اندر
ماری رگڑاؤں کی۔ ہر کمرے کے اندر سے
سینچوٹ کے نیٹ ٹاچے ۵۰ روپے اور گھر کے
کچھ راشن پالی تین سال سے شاپ مالز کے
سرپرستوں کی یہی موصوفہ تھی کہ
بے آرام رہتے یا باہر گھومتے پھرتے رہتے اب
شہر کی دکانوں میں سہارا کا دھندلچوٹ ہو کے
رویا ہے۔ خدمت اب جان مارنے جیر گزارا نہیں
تھی یہ شہر ہوتا ہے جیب میں پڑا ہو تو حالات کی
میتھی تصویر دکھائی ہی نہیں دیتی جیب خالی ہو جاتی
تو تب موتی ٹھکانے آتے ہیں۔
خیر انے بے رنگ مہرہ بیا۔

نہیں کرتی۔“

”نسیو! اپنے وقت میں من مانی کر کے اپنی پسند لی
تو رہی۔ ریشہ ہیں اور جب دوسروں کا وقت آتا ہے تو
تو نہ مانی لے جاتے ہیں۔“

ویرجہ نہ صرف دل میں سوچ رہی تھی بلکہ یہ خیال
بے یسے سے زریعہ نیراتک بھی پہنچ رہا تھا۔
'جی میں یہ اٹھ گیا ہرست عبور ہی کہاں کیا ہے
نہاں اٹھتا ہے اس میں سے چاہے۔'

• یہ دیکھ کر صاحب قریبی چیتاوں کا شہرت
پتوں سے محو ہو

پند کی شہلوی کر کے بندہ نہ آگے کار ہوتا ہے نہ پیچھے
 نہ اپنا جنتان خود بھٹتا ہے نہ تائب پایا ٹھیک ہی تائب کہتے
 تھے کہ تیرا انتخاب یہ نہیں تھا کہ تیرا رہا نہیں رہا
 سے تھی نہ نہ تھی تھی تھی تھی تھی تھی تھی تھی

”اٹھ جا، جوانی بڑا ایسا تو قسمیں میں ترا مار رہا ہے۔
بہت بڑا لڑکا ہوا۔“

وہ کروٹ بدلتا کر پھر سوتا۔ یہ اگونیہ آتے ہیں۔
اس کی ہیں حریتیں تو اسے طیش دلاتی تھیں۔ وقت
لی قدر نہ کرنا اپنے موؤں کے حساب۔ نام لانا اور
آسانی کی عادت گویا ارسال کی مچھنی میں پانی ہونی
تھی۔ سونا اور ٹھوٹے پھرتے موج اثرات رنگا۔ اس
زندگی کا اس سے زیادہ اور کوئی مقصد نہیں تھا۔

”خود ہی تو کہتے ہو۔ تاہم سے جاؤں تو پھر کچھ کہنا ہوگی۔ اب تاہم سے جگاتی ہوں تو اٹھتے نہیں ہو۔ اس طرح کاروبار نہیں ہوا کرتا ارسلان۔“

”بھی تو دس ہی بجے ہیں“ سناڑھے دس بجے تک
میں جا کر دوکان بھول حں گا۔“ وہ غنواگی میں اسے
راتھا۔

۲۰ بھی اٹھو گے تو ساڑھے دس تک پہنچو گے۔
 آج صبح گھنٹہ تو تمہیں واش روم کے لیے چاہیے
 گھنٹے میں ناشتہ ہو گا۔ مزید آدھ پون گھنٹہ کام پر
 کے لیے ہمت جمع کرنے میں لگ جائے گا، روز کی
 پھر بارہ ساڑھے بارہ بجائے نکلو گے۔ اس وقت
 لوگ تو بھین کی کھائی کر چکے ہوتے ہیں۔" دو بج
 رہی تھیں۔

”کیا صبح صبح سرکھٹا شروع کر دیتی ہو۔ کہتے
اٹھ رہا ہوں۔“ وہ دوبارہ ^{چنبھوڑ} جاتے پر
برافرونتہ ہوا۔

”چھپا پون چھتے تے دھماکے کا یہ فریاد انجمن
رہنماؤں کس سے زیادہ اسیٹھنا نہیں ہے۔ یہ
”افواہ لویہ دھماکا بھی چھپا دھماکا“

”تم نے پھر وہی ہمیشہ والی طعنے بازی شروع کر دی۔“

”ظلمے بازی کی کیا بات ہے جو حقیقت ہے وہی بیان کر رہی ہوں۔“ وہ جل کر بولی۔

”ہونہ حقیقت بیان کر رہی ہوں“ زندگی اجیرن
 کر کے رکھ دی ہے۔ ”ایک دھڑکے ساتھ دروازہ بند
 ہوا تھا اب دُاش روم میں سے آواز آرہی تھی۔
 ”اچھا خاصا پرسکون اور عیش و آرام والی زندگی گزار
 رہا تھا۔ بھابھیاں کھانا پینا وقت پر اور حسبِ خواہش
 دے دیتی تھیں۔ بھائیوں سے تفریح کے لیے معقول
 رقم مل جاتی تھی نہ فکر نہ فاقہ۔ اپنے دل اتھے اپنی
 راتیں تھیں۔ لے کر اچھا دیا مجھے روٹی، مال کے جگر
 میں۔“ اودیا آواز بلند ہو رہا تھا۔

یہ الکی جہت جمل کر رہی۔

”تہا تو میری زندگی ہوئی ہے۔ واپس آتی ہوں اس وقت کو“ جب بابا کا انتخاب رد کر کے ان کے سامنے تمہارے لیے تین ترکھڑی ہوئی تھیں۔ تمہارے حق میں یہ سب کچھ اپنے تئیں اپنی سمجھ داری اور دور اندیشی کا ثبوت دیا ”آج روٹی ہوں اس گھڑی کو۔“

”بہت اچھے ہے پیپا کا انتخاب رو کرنے کا تو اب مدد او
 نا دے جو اسی ”انتخاب“ کے پاس۔“ وہی روایتی
 مردانہ خوب پنہنی اور اتار پرستی کا مظاہرہ۔ وہ کھس کر
 بے وقوفی میں گھس گئی۔

ہیں یا تھا تو یہ مریخی کا ذریعہ تھا۔ صرف کچھ ہی کیا
جہان فطرت میں یہ سیدوں میں اور ٹوٹ پھوٹ کا نمونہ
تھا۔ وہ ارباب سے چوٹا اور سب سے برابر مقدار میں

میلے ہے توازن اور بعد اقبال ہوا
تو اس نے کہا کہ میں نے یہ سب کیا ہے

ہو یا نہ ہو، یہ سب اہم نہیں ہے، اہمیت یہ ہے کہ جو شخص
ماتر میں ہم سے ہے، اسے سب سے پہلے جاننا چاہیے۔
اس کے علاوہ وہ بھی جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے۔

ارسلان سے رشتہ بابت دوم سے برآمد ہوا تھا۔
 "یہ عذاب ہے" آج کل یہ جملہ ارسلان کا ٹکے
 کا ہے۔

مگر مہمانی ہی نہیں آریا۔ شمس اناریا میں
بہارِ سحر بدل گیا شبِ بزمِ مہمانی ہے شاد و ریشم
یا تم بھی جاو چلو دھوپ کے سرور کی طرف

اداره خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو (سماجی) پیڑیا

شائع ہو گیا ہے

خوبتر سرور کے آفٹ چھپائی، مضبوط جلد

قیمت / 600 روپے

پتا ذیل سے خریدیں

- مکتبہ عمران ڈائجسٹ ، اردو ، بار کراچی
- احمد نیوز ایجنسی ، میڈیا ریکٹ کراچی
- سلطان نیوز ایجنسی ، خیبر پختونخوا
- اشرف ٹیک ایگسٹیو ، بہار پور ایگسٹیو

فرید الدین گنج شکر و عارف

یہ کہ ان کی موجودگی میں میں نے جس کی سیلیکٹ
یہ کہ وہ ان کی باہر سے پہلے تھے۔

”میں چل رہی تھیں اب چاہتے ہی تھیں چلا

③

100

”میں نے ضرورت تھی میں نے سب سے پہلے آپ کو

نے جس کراس کی پھل کی تاس پائی۔
"کوں ہوں میرا ساس بند ہو با۔"

۱۔ میری عمر ۲۵ سال ہے
 ۲۔ میری تعلیم ۱۲ ویں کلاس تک ہے
 ۳۔ میری شادی ۲ سال پہلے ہوئی ہے
 ۴۔ میرے پاس ۲ بچے ہیں
 ۵۔ میری سالانہ آمدنی ۱۰ لاکھ روپے ہے
 ۶۔ میری عمر ۲۵ سال ہے
 ۷۔ میری تعلیم ۱۲ ویں کلاس تک ہے
 ۸۔ میری شادی ۲ سال پہلے ہوئی ہے
 ۹۔ میرے پاس ۲ بچے ہیں
 ۱۰۔ میری سالانہ آمدنی ۱۰ لاکھ روپے ہے

پہلے وہ منہ لہذا غلام غلام لی آتا ہے
تو چوتھے سے اسے پر سے اٹھا لیا

وہ نصیحتی ہو ساری رو داہ سناریں تھی۔ رجبہ پیش
میں چائے پاتے سوکے س رہی تھی۔ ساتھ میں سوچ
میں رہی تھی۔

تو نہ کہ ہوتا ایسا وہ بندہ پسند ایسے لچکی اور نکلتے
بندے کا انتخاب کریں گی تو یہی ہو گا۔ بھلا عمر خان ایسے
ہو سکتے ہیں وہ توجہ کی جتنی دولت مند آدمی ہیں اور
ارسلان بھائی انہیں تو بیوی سے ٹھیک طرح بات
کرنے کی تمیز بھی نہیں ہے۔ کیسے ہر وقت لڑتے
جھگڑتے اور بے عزتی کرتے رہتے ہیں۔ پھر بھی نیرا
بھائی کتنی ہیں لکھ خامیں سہی ایک خوبی ایسی ہے
جس کی وجہ سے میں ارسلان کے ساتھ تا عمر اسی
کسمپرسی کے ساتھ جینے کو تیار ہوں، وہ میرے ساتھ
مخلص ہے بے شک وہ غیر مستقل مزاج ہے۔ نکما
ہے۔ غصہ ور ہے یا احساس نہ کرنے والا انگریز ہے تو
سر پر میرا اس کے دل میں میں ہی میں ہوں میرے
عدوہ کوئی نہیں۔ عورت تو وفادار ہوتی ہی ہے۔ مرد میں
وفادار اور بے وفائی پر لٹنے کی خوبی ہو تو ازواج اپنی
زندگی کا سب سے عورت جس کے پایادہ ملے کر سکتی
ہے۔

جب سے نیرا نے عمر خان کے رشتے کی مخالفت میں
نصیہ آپ کو دوٹو دیا تھا تب سے وہ رجبہ کی ناپسندیدہ
شخصیات کی لسٹ میں نام لے چکی تھی۔

”عجیب دوغلی فطرت کی مالک ہوئی ہیں یہ عورتیں“
وہ عشق و عاشقی میں بڑے کے ماں باپ کی مخالفت کے
باوجود پسند کی شادی کر لیتی ہیں اور جب اپنی آگ
خندہ پڑ جاتی ہے تو اپنے نقش قدم پر چلنے والی دوسری
عورتوں کو لعن لعن کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایسے پاک
بازار صاف شگاف بن جاتی ہیں جیسے خود تو محبت کے
سے قدرت کی ہیں نہ ہو۔ خود بھی تو اسی طرح ماں باپ
سے چھپ کر نفیہ ملتا تھا کہ کتنی ہوں گی۔ آپس میں
رشتہ سے اپنے خود یہ فون دھار لیتی ہوں گی۔ سب

سب میں یہاں یہاں ہی رہا ہے۔
میں نے یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں
یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں
یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں

اسے تو اب ابھی نہیں بتا دیا ہے۔
نیرا وہاں وہاں یہاں یہاں یہاں یہاں
راتی میں ابھی یہاں یہاں یہاں یہاں
راتی میں ابھی یہاں یہاں یہاں یہاں

”کیونکہ وہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں
لی لڑی تھی بہت سے رشتے تھے عمر خان کے اپنی
سے لڑے اپنا آپ روایا۔ یہاں وہاں یہاں یہاں
نہ دن چھین نصیب ہوا ہے نہ رات نہ دن نہ رات
یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں
یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں

”ابھی! عمر خان کی فیملی بہت امیر ہے۔ وہاں یہی
خبر افات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔“ وہاں یہی دل میں
نیرا ابھی بھی کو کوئی ہوئی اصفائی پیش کرنے لگی مردہ کی
ہی لیا جو مان جا رہی ہے۔

”یہ بھی تو ایک مخالف نکتہ ہی ہوا ناں! اہم تو
یہ ہے کہ وہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں
وہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں
یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں
یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں
یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں یہاں

”مگر آ میں تو نہیں مانے۔“ اس نے بٹو دیا۔
جس لہرہ میں۔

”یہ مطلب ہے“ کی تھی یہاں یہاں یہاں یہاں
اپنے مطلب سے آتی تھی یہاں یہاں یہاں یہاں
زبردستی جیتا تھا۔“

”ایک تو عمر خان نے اتنی منت سماجت کر کے اپنی

میں ہوں۔ ہمارے کہہ سناؤں سے اسے ہر
کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

نہیں یہاں یہاں کہہ رہی تھی اور اسے میں
کہاں کہہ رہی تھی۔ اماں نے تو اسے لے لی اور

میں نے بھیج دیا۔
میں نے بھیج دی تھی۔ اسے اس کی ماں پہنکا کر

نئی سے تمہاری زیاں ہاتھ دے دے گی۔ کھلنی ہے اس
کی جگہاں سے مدینہ کی کر رہی ہو تم۔

نہ تمہاری کی بیات سے میں تو صرف اتنا کہہ رہی
ہوں کہ جب تم خانہ کی والدہ عزت سے گھر آ کر
تو سے رشتہ ٹھک چکی ہیں تو پھر یہ کس بات کی
صدا گنگے بیٹھی ہے۔

وہ نہ است کو ب اثر سمجھتے ہوئے بالآخر وہ وہو
سوں جواب پر اتر گئی۔ خسیہ پہنکا کاپٹی کی صورت
دیکھنے کے بعد اب نیرا کے چہرے پر غم جمائے ہوئے
ہو گیا تھا۔

”اب بھی تو محبت کے بجائے مخالفت کا مظاہرہ
کر رہی ہیں۔“ وہ اکل کھرے انداز میں بولی۔ ”بٹی کی
رے کے بجائے ایرے غیروں کی آراء کا آپ کو زیادہ
خیال ہے۔“ اس نے نیرا پر جوت کی تھی۔

”خیر نیرا جو نیرا سے بد تمیزی کی۔ تم سے بڑی ہے وہ
اور میری سچی بہن بھی ہے۔“ اماں نے خوشخوار نظروں
سے اسے منور تھا۔

نیرا بڑی طرف اپنی سکی محسوس ہوئی۔ ماں کے
ہاتھ ہاتھ وہ آئے مہمان سے بھی کھلم کھلا بد نظمی
پڑھتا ہوا رہی تھی مگر نیرا اس کی کیفیت سمجھ سکتی
تھی۔

میں نے محبت کی بات نہیں سے ساری تیزو
تنبہ چھیں۔ انہیں سب باب اور بد زبان بناتی
تھی۔ وہ اپنی اپنی دنیا اور اپنی اپنی جہ
میں رہتی ہیں۔

میں نے کہا کہ تمہاری ماں نے کہا ہے کہ
نہیں یہاں یہاں کہہ رہی تھی اور اسے میں
کہاں کہہ رہی تھی۔ اماں نے تو اسے لے لی اور

میں نے بھیج دیا۔
میں نے بھیج دی تھی۔ اسے اس کی ماں پہنکا کر

نئی سے تمہاری زیاں ہاتھ دے دے گی۔ کھلنی ہے اس
کی جگہاں سے مدینہ کی کر رہی ہو تم۔

نہ تمہاری کی بیات سے میں تو صرف اتنا کہہ رہی
ہوں کہ جب تم خانہ کی والدہ عزت سے گھر آ کر
تو سے رشتہ ٹھک چکی ہیں تو پھر یہ کس بات کی
صدا گنگے بیٹھی ہے۔

وہ نہ است کو ب اثر سمجھتے ہوئے بالآخر وہ وہو
سوں جواب پر اتر گئی۔ خسیہ پہنکا کاپٹی کی صورت
دیکھنے کے بعد اب نیرا کے چہرے پر غم جمائے ہوئے
ہو گیا تھا۔

”اب بھی تو محبت کے بجائے مخالفت کا مظاہرہ
کر رہی ہیں۔“ وہ اکل کھرے انداز میں بولی۔ ”بٹی کی
رے کے بجائے ایرے غیروں کی آراء کا آپ کو زیادہ
خیال ہے۔“ اس نے نیرا پر جوت کی تھی۔

”خیر نیرا جو نیرا سے بد تمیزی کی۔ تم سے بڑی ہے وہ
اور میری سچی بہن بھی ہے۔“ اماں نے خوشخوار نظروں
سے اسے منور تھا۔

نیرا بڑی طرف اپنی سکی محسوس ہوئی۔ ماں کے
ہاتھ ہاتھ وہ آئے مہمان سے بھی کھلم کھلا بد نظمی
پڑھتا ہوا رہی تھی مگر نیرا اس کی کیفیت سمجھ سکتی
تھی۔

میں نے محبت کی بات نہیں سے ساری تیزو
تنبہ چھیں۔ انہیں سب باب اور بد زبان بناتی
تھی۔ وہ اپنی اپنی دنیا اور اپنی اپنی جہ
میں رہتی ہیں۔

اور

میں نے محبت کی بات نہیں سے ساری تیزو
تنبہ چھیں۔ انہیں سب باب اور بد زبان بناتی
تھی۔ وہ اپنی اپنی دنیا اور اپنی اپنی جہ
میں رہتی ہیں۔

ہر کوئی افسردہ آفریں میں ہوا تھا۔

اس نے اب گاہ بچہ تھا کہ نصیروہ کی بھاری اور محاذ فہم خانہ بھی دنگ رہ گئی تھیں۔

”ای! میں نے آپ کو صاف اظہار میں بتا دیا ہے کہ میں آپ کے تجویز کردہ انتخاب کو رد کرتی ہوں، مجھے پھر سے نہیں عمر خاں سے شادی کرنی ہے۔ اور اس کے لیے آپ کو عمر خاں کے گھر جا کر اس کی ممانعت کی بات کرنا ہوگی۔“

”لعنت ہے مجھ پر اگر میں اپنی عزت نیلام کر کے خود اپنی کارشتہ لے کر اس بد دماغ عورت کے پاس جاؤں تو نصیروہ غرا میں۔“

”تمہارے تو دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے جو اس ونڈے کی تال پہ ناچ رہی ہو۔ وہ دن کو دن کہے تو تم کہو اس اور رات کہے تو۔“

”بس بس“ انہیں برا بھلا کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بے مروتی سے بولی۔

”اور ماں۔۔۔! تمہاری ماں کو کوئی جیسے مرضی نہیں کرے وہ قبول ہے؟“ انہوں نے ملا متی نظروں سے سوال کیا۔

”اس میں ذلت کی کیا بات ہے۔“ اس کے ماتھے پر شکنیں نمایاں تھیں۔

”کون سا نیا کام کرنے جا رہی ہیں۔ ہمارے اس دم میں بھی تو ایسی مثالیں ہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود اپنا رشتہ بھیجا تھا۔ کئی مہلک میں بڑی والے رشتہ لے کر گھر جاتے ہیں۔“

”واہ رے انسان! اپنے مطلب کے لیے مذہب، دنیا، لوگ جانے کہاں کہاں سے مثالیں کھینچ لیتے ہیں۔“ اس کے قدم بلیتے پر ہی رک گئے تھے۔

”تم اپنے خلیا فیئر میں محترم و مقدس ہستیوں کی مثال میں مست لود توفیق ہے تم جیسی اوپر اس سے تو میں سب اوپر اچھی تھی۔“ نصیروہ کے دل میں یہ عجیب تھا۔

”اب تو پیراہن مٹی۔ اب یہ ہو سکتا ہے۔ پہلے سوچنا

میں اس کی تادیب کرنا ہے۔ وہ بھی نہیں

تو توندی ہو گئی ہے اس مکار اور ہنس۔۔۔

”جیسے یہ عورت تھی، اس نے اس کی ماں کی تو وہ امیر بھی ہے اور گلوں سے بھی۔۔۔ یہ ہے یہ کہ کچھ لوگ اس کے لیے کی ایک قابل صورت ہے۔ وہ وہ اتنی جذباتیت سے کہ اس کے لیے۔۔۔“

”بھلا سے کلام ماں سے اس کے لیے اس کے لیے سب بی اور خاندانی شایان ہو رہا ہے۔ وہ جیسے یہ اس نے میں عزت اور مقدمہ یہ اس کے لیے اس کے لیے اندازہ ہے، وہ میں اس کے لیے اس کے لیے اس کی ماں تو بھلا بھی تو پیراہن مٹی ہے۔“

جب وہ بہت غصے میں آتی تھیں تو انداز میں بھی بدل جاتا تھا۔

”پاؤں کی جوتی بن کر ہر کسی کے قدموں سے روندی جائے گی۔ وہ ماں بیٹا تیرا تیرا بیٹا ہے۔“

”مرد خوبصورت اور ماں وار ہو تو اس کے لیے اس کے لیے ایک نئی طرح وارڈ کی شٹ کرانے و تیار راقی ہے تو کس کھاتے میں ہے۔“

وہ اسے کھڑی کھڑی سنار ہی تھیں اس کی حیثیت، اہمیت واضح کر رہی تھیں مگر سناتا تو وہ جس کی بسارت اور سماعت سلامت ہوتی۔ اس کی آنکھ پر پٹی اور نگاہ پر پردہ پڑے تھے۔

ماں بھلا سمجھاتی رہی مگر اس کے کان پر ہوں نہ رہیں گی۔

”اپنی قدر پہنچو۔ اپنی عزت کا خیال کرو۔ رشتہ اچھا ہوتا اور وہ لوگ عزت و احترام سے چاہتے ہیں۔“

”اس صورت میں ناممکن ہے“ قطعی ناگہان میں اس نے جاؤں تو بھی وہاں جا کر کہیں اس کی عزت میں اس کے لیے شرمناک کام نہیں ہوں گی۔ تو یہ تو اس کے لیے اس کے لیے میری بے شرمی ہے۔ یہ ہے بیٹے۔“

اس درجہ متکلم ہے۔ وہاں یہ رشتہ ہے۔

”آپ یا تو میں مر جاتی ہوں۔“ وہ سسٹانی

نیت کا شکار ہو گئی۔

[illegible][illegible]

یا مال بریدہ کیا ہے علیٰ مکتفی کا مظاہرہ
 ہے اس سے ثابت ہے کہ اس وقت جو جملہ احوال

میر خاں کو اس وہ پسند نہیں ہوئی بلکہ وہی محبت

میں شامل ہوئی۔ اسے سنا کر وہ بہت خوش ہوئی۔
 "ابھی تک تو میری زندگی بڑی سادہ رہی ہے۔
 اب تو یہ سب کچھ میری زندگی میں آ رہا ہے۔
 اور جیسے ہی میں اس کے اندازے کو درست
 ثابت کر دوں گی، اسے پانچ سو روپے عہدہ کی دوست
 پر بھیج دیں گے۔ یہ تو صورتِ کار ہے اور وہ بھی
 وہاں پہنچے گا۔ اس کا سامنہ ہوا اور وہ بھی
 "جس میں ہمارے لیے سے بھلا سے مل رہا ہے۔
 کہ جلد وارث حسن اور حشر ملاں سر لایا گیا ہو گا۔
 اور پھر عامی شکل کی بے کاری لڑکی ریحہ کو اپنی
 بیٹی سے دے دے گی۔ اسے شرم محسوس ہونے لگی۔
 پھر وہیں کے چاند کے سامنے ٹھہرا ہوا انھما دیا
 "یہ نظر ہے۔ وہ اس کی ذات میں ہے انتہائی کڑے
 ہوتے ہیں۔ مگر بچے کے بدلتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔
 "بیٹے! میں نے شروع سے یہ سمجھ ہی لیا تھا کہ
 تمہارے لیے کتب کر رکھا تھا۔ وہ گزشتہ چار سال سے
 لندن میں ایسٹرڈریشس کرنے گئی ہوئی تھی۔ اس
 نے تم سے ملانے میں دیر ہو گئی کہ وہیں کیسی لگی
 ہو بنا کر لے آؤں گی؟ انہوں نے لطف لے کر
 پوچھا۔

"اور یہاں سے مملہ۔" وہ ٹپلا "مگر مملہ وہ ریحہ۔"
 "ار۔ اس دو گڑھی کی لڑکی کی کیا حیثیت ہمارے
 ساتھ؟ رخصت ہو تو گاؤں کے آبائی گھر میں بھیج دو۔
 "میں جانتی رہی ہوں تمہارے نام سے ساری عمر
 اور اب اسے یہاں بھیج دو۔ ساری شادی کی راہ میں رکاوٹ
 بنے تو طلاق دے کر فارغ کرو۔"

اب ریحہ کے پاس وہی راستہ جاتی ہے تھی۔
 "میں نے اپنی عمر خاں کو اپنی محبت کے واسطے بھی
 "یہ تمہارے لیے تھا۔ دل جو سامنے تھا وہ تو قطعی
 بدلا ہوا۔ جیسی تو رہا ایک سنگدل انسان تھا۔

طابق کے کھانے جاتی اور پھر اپنی اس بری طرح
 ماری ہوئی بازی کی کہانی سنو سنو ماری یا نہ ماری کہ
 محمدان کار میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اس طرح جو

میں نے سنا ہے۔ اسے سنا کر وہ بہت خوش ہوئی۔
 "ابھی تک تو میری زندگی بڑی سادہ رہی ہے۔
 اب تو یہ سب کچھ میری زندگی میں آ رہا ہے۔
 اور جیسے ہی میں اس کے اندازے کو درست
 ثابت کر دوں گی، اسے پانچ سو روپے عہدہ کی دوست
 پر بھیج دیں گے۔ یہ تو صورتِ کار ہے اور وہ بھی
 وہاں پہنچے گا۔ اس کا سامنہ ہوا اور وہ بھی
 "جس میں ہمارے لیے سے بھلا سے مل رہا ہے۔
 کہ جلد وارث حسن اور حشر ملاں سر لایا گیا ہو گا۔
 اور پھر عامی شکل کی بے کاری لڑکی ریحہ کو اپنی
 بیٹی سے دے دے گی۔ اسے شرم محسوس ہونے لگی۔
 پھر وہیں کے چاند کے سامنے ٹھہرا ہوا انھما دیا
 "یہ نظر ہے۔ وہ اس کی ذات میں ہے انتہائی کڑے
 ہوتے ہیں۔ مگر بچے کے بدلتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔
 "بیٹے! میں نے شروع سے یہ سمجھ ہی لیا تھا کہ
 تمہارے لیے کتب کر رکھا تھا۔ وہ گزشتہ چار سال سے
 لندن میں ایسٹرڈریشس کرنے گئی ہوئی تھی۔ اس
 نے تم سے ملانے میں دیر ہو گئی کہ وہیں کیسی لگی
 ہو بنا کر لے آؤں گی؟ انہوں نے لطف لے کر
 پوچھا۔

"یہ کیا میاں کی گارمنٹس کی ذاتی شاپ ہے؟
 یہ وہی صلا ہے بچوں کے پیروں کی خریداری کرنے
 مرشل گئی ہوئی تھیں۔ یہ لطیفہ ہے بھی۔"
 واپس آئی تو ارساں نے بھیچائی کی۔ آج اس کی
 چھٹی تھی۔

"بھئی تمہاری شاپ پر جو سوٹ مجھے اچھے لگے تھے
 میں نے۔۔۔ بے مزید وراثی کے لیے کمرشل گئی
 تھی۔" اس نے بیگ رکھا۔
 "تمہا کر فریش ہو جاؤ پھر راول ڈیم چلتے ہیں۔"
 ارساں نے فنانٹ پروگرام بنالیا۔
 "نہیں میں فی الحال نسیو تپ کی طرف جانے کا ارادہ
 رکھتی ہوں۔"

"نسیو نہیں رقبہ کو میری رقبہ ہر وقت
 ہی تھکی رہتی ہو۔" وہ بھورا۔
 "پھلانیہ" "نیرا نے تھوڑا کر دیکھا" اور جو میں اس
 نے جانوں تو کون میرا سر کھاتا ہے کہ تپا کی طرف
 "تپا۔"
 "مگر اس وقت یہ ضرورت پیش آئی ہے۔"

نہ سب میں۔۔۔ ماری مانتے نہ سائی۔
 بعد وہ مسوہ پڑن طرف نہ ہوئی۔
 اور ماں کو گویا سید رہے۔
 اور وقت روئی تھی۔

اتر دو میں کہ رات تک بند رہے وہ ہو گیا۔ ارمان
 نے بھی اس سے رنج کی غارش کی۔
 ”یہ بھاپ آپ کی صحت کے لیے بھی ست خدوری
 ہے۔ آپ ایک ہی تو او۔ وہ آپ کی۔ کیوں اپنے آپ کو
 اندر سے ختم کیے جا رہی ہیں۔ چپ چپ کھل رہی
 ہیں سات ماہ سے اس کی جدائی میں۔“

بالآخر سات ماہ بعد ربیعہ نے دوبارہ اسی مانوس اور
 مت کی خوشبو سے مہکتے نلگن میں قدم رکھا تھا۔
 ماں بھی کے بھاپ کا منظر دیکھتا نظر آ رہا تھا۔
 جب سنبھلے بادل چھٹے تو ارساں نے ہی تجویز دی

”ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے ربیعہ! بائیس برس کی
 نو جوان لڑکی ہو۔ یوں اس شخص کے نام پر عمر بھر بیٹھے
 رہنے اور خود کو برباد کرنے سے بہتر ہے طلاق لے کر
 نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرو تمہیں اب بھی اچھا
 رشتہ مل سکتا ہے۔ میں خود کوشش کروں گا۔“

”نہیں ارساں بھائی۔“ اس عاجزہ و ہیما مگر اٹل
 تھا۔ ”میں طلاق نہیں لوں گی۔“

”تو کیا باقی ماندہ زندگی اس دور افتادہ گاؤں کی ویران
 حوٹی میں گزار دو گی۔“ نیرا نے سرزنش کی۔
 ”ہاں۔“ اس نے آنسو پی لیے۔

”یہ سزا تو مجھے ملنی چاہیے تھی۔ جرم ہی اتنا بڑا ہے
 جو مج میں نے اپنے ہاتھوں سے بوئے ہیں ان کی
 تیرا کرنا بھی میرا فرض بنتا ہے۔“

”مگر اس طرح یہ۔۔۔“ نیرا نے خاموش دہل
 رفتہ رفتہ عیسویہ کی طرف دیکھا۔

”ہاں اپنی قسمتوں کے خود مالک بننے کی کوشش
 ہے۔ میں ان کے ساتھ کی ہوتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی
 ہوئی۔

نہ سب میں۔۔۔ ماری مانتے نہ سائی۔
 بعد وہ مسوہ پڑن طرف نہ ہوئی۔
 اور ماں کو گویا سید رہے۔
 اور وقت روئی تھی۔
 اتر دو میں کہ رات تک بند رہے وہ ہو گیا۔ ارمان
 نے بھی اس سے رنج کی غارش کی۔
 ”یہ بھاپ آپ کی صحت کے لیے بھی ست خدوری
 ہے۔ آپ ایک ہی تو او۔ وہ آپ کی۔ کیوں اپنے آپ کو
 اندر سے ختم کیے جا رہی ہیں۔ چپ چپ کھل رہی
 ہیں سات ماہ سے اس کی جدائی میں۔“

بالآخر سات ماہ بعد ربیعہ نے دوبارہ اسی مانوس اور
 مت کی خوشبو سے مہکتے نلگن میں قدم رکھا تھا۔
 ماں بھی کے بھاپ کا منظر دیکھتا نظر آ رہا تھا۔
 جب سنبھلے بادل چھٹے تو ارساں نے ہی تجویز دی

”ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے ربیعہ! بائیس برس کی
 نو جوان لڑکی ہو۔ یوں اس شخص کے نام پر عمر بھر بیٹھے
 رہنے اور خود کو برباد کرنے سے بہتر ہے طلاق لے کر
 نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرو تمہیں اب بھی اچھا
 رشتہ مل سکتا ہے۔ میں خود کوشش کروں گا۔“

”نہیں ارساں بھائی۔“ اس عاجزہ و ہیما مگر اٹل
 تھا۔ ”میں طلاق نہیں لوں گی۔“
 ”تو کیا باقی ماندہ زندگی اس دور افتادہ گاؤں کی ویران
 حوٹی میں گزار دو گی۔“ نیرا نے سرزنش کی۔
 ”ہاں۔“ اس نے آنسو پی لیے۔

”یہ سزا تو مجھے ملنی چاہیے تھی۔ جرم ہی اتنا بڑا ہے
 جو مج میں نے اپنے ہاتھوں سے بوئے ہیں ان کی
 تیرا کرنا بھی میرا فرض بنتا ہے۔“

”مگر اس طرح یہ۔۔۔“ نیرا نے خاموش دہل
 رفتہ رفتہ عیسویہ کی طرف دیکھا۔

”ہاں اپنی قسمتوں کے خود مالک بننے کی کوشش
 ہے۔ میں ان کے ساتھ کی ہوتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی
 ہوئی۔

نہ سب میں۔۔۔ ماری مانتے نہ سائی۔
 بعد وہ مسوہ پڑن طرف نہ ہوئی۔
 اور ماں کو گویا سید رہے۔
 اور وقت روئی تھی۔
 اتر دو میں کہ رات تک بند رہے وہ ہو گیا۔ ارمان
 نے بھی اس سے رنج کی غارش کی۔
 ”یہ بھاپ آپ کی صحت کے لیے بھی ست خدوری
 ہے۔ آپ ایک ہی تو او۔ وہ آپ کی۔ کیوں اپنے آپ کو
 اندر سے ختم کیے جا رہی ہیں۔ چپ چپ کھل رہی
 ہیں سات ماہ سے اس کی جدائی میں۔“

بالآخر سات ماہ بعد ربیعہ نے دوبارہ اسی مانوس اور
 مت کی خوشبو سے مہکتے نلگن میں قدم رکھا تھا۔
 ماں بھی کے بھاپ کا منظر دیکھتا نظر آ رہا تھا۔
 جب سنبھلے بادل چھٹے تو ارساں نے ہی تجویز دی





نور محمد خان

مطابق مع...

چونکہ یہ فطرتاً ہی ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہی راستہ ہے۔
 یہ کہہ کر کہ ہم نے اس راستہ کو اختیار کیا ہے۔

یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ہم اپنے ملک کو ترقی دے سکیں۔











